نیاز فتحپوری

١ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

٢ - رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ کیا جائیگا

٣ - خط وکتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہین

٤ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

٥ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئن -

٦ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ - نگار

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخنامہ اجرت اشتہارات	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ	۱۴ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	(۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے	ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

جواب کیلیئے ٹکٹ آنا ضروری ہے — چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے

مرزا غالب

اردوے معلی ۔ عہ
عود ہندی ۔ عہ
دیوان غالب ۔ مشہ
مکمل دیوان ۔ صہ

مولانا نذیر احمد

سوئل سترجم ۔ عہ
الحقوق والفرائض ۔ سے
بنات النعش ۔ ۹
مراۃ العروس ۔ ۱۰
توبۃ النصوح ۔ ۱۲
موعظۂ حسنہ ۔ عہ
رویاے صادقہ ۔ عہ
ایامیٰ ۔ عہ
فسانۂ مبتلا ۔ عہ
ابن الوقت ۔ عہ
مصائب غدر ۔ ۱۲

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول ۔ عہ
" دوم ۔ عہ
" سوم ۔ عہ
الفاروق ۔ عہ
سیرۃ النعمان ۔ عہ
الغزالی ۔ عہ
المامون ۔ عہ
سوانح مولانا روم ۔ عہ
سفرنامۂ مصر وشام ۔ عہ
علم الکلام ۔ عہ
الکلام ۔ عہ
رسائل شبلی ۔ عہ
مقالات شبلی ۔ عہ
شعر العجم جلد اول ۔ سے
" دوم ۔ عہ
" سوم ۔ عہ
" چہارم ۔ سے
" پنجم ۔ عہ
موازنۂ انیس ودبیر ۔ سے
مضامین عالمگیر ۔ ۸
آغاز اسلام ۔ ۸
کلیات فارسی ۔ عہ
کلام شبلی اردو ۔ ۸

امیر مینائی

امیر اللغات ۔ عہ
صنمخانۂ عشق ۔ عہ
مراۃ الغیب ۔ عہ
محامد خاتم النبیین ۔ ۸
ضیاے سخن ۔ عہ
مکاتیب امیر مینائی ۔ عہ

رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد ۔ عہ
سیر کہسار ۔ عہ
خدائی فوجدار ۔ عہ
جام سرشار ۔ عہ
الف لیلی بطرز ناول ۔ صہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ — جلد ۱۳ - شمار ۲

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شائع ہوتا ہے ۔ قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول ۶ر

فہرست مضامین سنہ ۱۹۲۸ء

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

CHECKED 1956

جلد (۱۳) فروری ۱۹۲۸ء شمار (۲)

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے رسالہ نے جہاں "گوش سخن شنو" اور "دیدۂ اعتبار" کی کیفیتیں دیکھیں، وہیں بعض کی "چین پیشانی" کا بھی منظر سامنے آیا۔ اس پر بجائے شکریہ کے مجھے صرف اظہار مسرت کرنا ہے اور اس کو یہ کہکر ختم کر دینا کہ "سخن شناس نۂ دلبرا" بہر حال مجھے ہنوز یہی حجاب دامنگیر ہے کہ مومن کی شاعری کے متعلق اب تک اپنے حوصلہ کے مطابق کچھ نہیں کر سکا۔

خیال تھا کہ مومن کے متعلق بعض وہ مضامین جو جگہ کی کمی کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکے فروری میں درج کر دئے جائیں گے لیکن میں نے یہ خیال ترک کر دیا، کیونکہ بار بار ایک ہی موضوع کی تکرار بھی بے لطف سی بات ہے۔ بعض وہ حضرات جو جنوری کے رسالے سے خائف ہو گئے ہیں امید ہے کہ اب یہ سنکر مطمئن ہو جائیں گے۔

اس مہینے کے مضامین میں ہمارے عزیز دوست جناب ذور ام اے کا مضمون سلطان محمود غزنوی کے علم و فضل اور اس کی علم پرستیوں کے متعلق بہت دلچسپ و پر از معلومات ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے بعض ایسے مسائل پر بھی مخالف روشنی پڑتی ہے، جو اس وقت تک حقائق مسلمہ میں داخل تھے۔

جناب زور اس وقت ولایت میں تحقیق لسانیات کے لئے مقیم ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ بہت جلد ملک اُن کے اکتسابات علمیہ سے فائدہ اُٹھائے گا۔

دوسرا مضمون "افسانۂ اردو" جناب اقدس حیدرآبادی کا ہے جس میں دکن کے ایک پُرانے شاعر عاجز کا تذکرہ اور انکا کلام پیش کیا گیا ہے مجھے اس سے اختلاف ہے کہ عاجز اگر میر کے ہمعصر ہوتے تو اُن کے ہمصفیر بھی ہوتے۔ عاجز کو میر کے رنگ کلام سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

تاہم، جناب اقدس حیدرآبادی کے ہم ممنون ہیں کہ اُن کے ذریعہ سے اردو کے ایک ایسے شاعر کے حالات اور اشعار شائع ہو سکے جن سے لوگ بہت کم یا بالکل آگاہ نہ تھے۔

اس مضمون کا عنوان "افسانۂ اردو" اسی وقت موزوں ہو سکتا ہے جب ایک سے زاید ایسے قدیم اور نامعلوم شاعروں کے حالات ایک سلسلہ میں شائع ہو جائیں ــ ہمیں یقین ہے کہ جناب اقدس اس عنوان کے صحیح مفہوم سے باخبر ہوں گے۔

تیسرا مضمون "پریم کی چوڑیاں" جناب اعظم کریوی کا افسانہ ہے اور اس قدر لطیف و پُر اثر ہے کہ اُس کو پڑھکر دیر تک مجھ پر کیفیت طاری رہی۔ گاؤں کی معاشرت کو پیش نظر رکھ کر فسانہ لکھنا آسان نہیں، اور اس سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو نہ صرف دیہات کی زندگی سے آشنا، بلکہ اس زندگی کی صحیح روح اور معصوم کیفیات سے بھی باخبر ہو۔ میں جناب اعظم کریوی کو مشورہ دونگا چونکہ وہ اس مخصوص موضوع پر فسانے لکھنے کی بہت کچھ اہمیت اپنے اندر رکھتے ہیں اسلئے انھیں اسی میں کمال بہم پہونچانے کی سعی کرنی چاہئے

"غالب بے نقاب" وہی موعودہ مضمون ہے جس کا ذکر جنوری کے رسالہ میں کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ بھی جناب قبلہ آرگس کا ہے جو اس سے قبل حافظ اور ابن یمین کے متعلق آتش افشانی کرکے اپنے کو بجا اور مجھے بالکل بیجا طور پر زمانہ کا نشانۂ ملامت بنا چکے ہیں۔

مانا کہ جناب "آرگس"، "آرگس ہی کی طرح ہزار چشم سہی لیکن یہ کیا تماشا ہے کہ اُن کی ہزار آنکھوں میں سے ایک نگاہ بھی "صلح جو" نہیں ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ انھوں نے اس مضمون میں بہت کچھ اپنا سرمایۂ تحقیق سامنے رکھدیا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اساتذۂ قدیم کے خیالات سے متاثر ہونے کے بعد لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ غالب باوجود اس "کشفِ حجاب" کے بھی غالب ہے اور اس کے شاعرانہ ابداعات اپنی جگہ بالکل عنصر غیرفانی کی حیثیت رکھتے ہیں

مجھے اکثر جگہ جناب آرگس سے اختلاف ہے۔ اگر یہ بحث لطیف چھڑ گئی تو اُس وقت تفصیل کے ساتھ عرض کرونگا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ بعض حضرات اس مضمون کو بھی "حافظ اور ابن یمین" کے مضمون کی طرح میری ہی طرف منسوب نہ کر دیں۔

مثنوی زہر عشق کی وجہ تصنیف کے متعلق جناب احسن لکھنوی کا مضمون ایک ایسا انکشاف ہے جو اس سے قبل بالکل تاریکی میں تھا ہم جناب احسن کے ممنون ہیں کہ انھوں نے تاریخ ادب کے ایک مختصر مگر ضروری واقعہ سے آگاہ کر دیا۔

میرے مضامین میں چنگاری ایک افسانہ ہے جس کے افراد کا اس نمبر میں تعارف کرا یا گیا ہے، میں ابھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آئندہ اشاعت میں ختم ہو جائیگا یا نہیں، کیونکہ جس خیال کو پیش نظر رکھ کر اس کی بنیاد ڈالی گئی ہے وہ تدریجی وضاحت چاہتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ اس کو دو نمبروں تک کھینچکر لیجائے۔ ڈائری کا ورق بھی گویا ایک افسانہ ہی کا حصہ ہے جس کے باقی حصے آئندہ نمبروں میں شائع ہوکر ایک مکمل فسانہ کی صورت اختیار کریں گے۔

استفسارات کے سلسلہ میں اس مرتبہ حضرت یوسفؑ کے حسن وجمال پر بحث کی گئی ہے۔ اگر کوئی صاحب میرے دعوے کے خلاف کلام مجید سے حسن یوسفی کو ثابت کردیں گے تو دنیائے شعر وادب" کی بڑی خدمت انجام دیں گے، مجھ سے تو یہ خدمت ادا نہیں ہوسکتی۔

جاوید مرحوم کی شاعری کے متعلق سلسلۂ کلام میں لکھنؤ اور دہلی کے رنگ شاعری پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پڑگئی ہے۔ کیونکہ یہ بحث خواہ کتنی ہی پارینہ کیوں نہ ہو اس وقت تک نہیں مٹ سکتی جب تک دنیا میں حقیقت ومجاز کا مسئلہ زندہ ہے۔

جناب اختر شیرانی اس دوران میں لکھنؤ آئے اور مجھے بھی انھوں نے کافی ستایا۔ اُن کی نظم لکھنؤ کی اُس فضا کی یاد میں ہے جہاں کی راتوں میں اب بھی بہت سے کبھی نہ طلوع ہوسکنے والے "چاند" جگمگایا کرتے ہیں۔ گو میرا تعلق ان سے ایسا ہی بعید کیوں نہ ہو جیسا جناب اختر کا تعلق "اُس حسن نازنیں" سے جس کی خلش کو وہ "یادگار لکھنؤ" سمجھتے ہیں۔ خدا کرے یہ "سب جوانی" کا جھوٹ ہو

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے اپنی غزل اب سے بچاس سال قبل پیچھے ہٹ کر کہی ہے اور وہ بھی دہلی کی سرزمین میں ساری غزل ایک رنگ وکیفیت کی ہے اور مرزا صاحب کے میر پرستی کا علمی ثبوت۔ اور حضرات کی غزلیں بھی اچھی ہیں اور بعض بعض شعر تو نہایت پاکیزہ ہیں۔ جن احباب کی نظمیں یا غزلیں ابھی تک شائع نہیں ہوئیں وہ آئندہ رسالہ کا انتظار فرمائیں۔

آئندہ ماہ سے ایک سلسلہ نہایت ہی مفید ولطیف ظریف شعراء کے تذکرہ کا شروع کیا جائے گا جو بعد کو مستقل کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ بعض اور اہم مضامین بھی زیر ترتیب ہیں

بعض احباب کے شدید اصرار پر اڈیٹر کی تصویر ماہ آئندہ کے رسالہ میں شائع کی جائے گی۔

نیاز فتحپوری

سلطان محمود غزنوی اور علم و فضل

سلطان محمود غزنوی کی ہستی کے متعلق اب تک متفرق غلط فہمیاں باقی ہیں، اس کی زندگی کا سیاسی پہلو متعدد شکایتوں کا آماجگاہ بنا رہا اور اسی لحاظ سے اس کی شخصیت مختلف النوع تعصبات کے لئے تختۂ مشق کا کام دیتی رہی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جہاں اُس کی سیاسی کارگزاریوں کی تحقیق و تفتیش میں خاص طور پر سرگرمی دکھائی جاتی ہے، علمی خدمات کی طرف بہت کم کوئی توجہ کرتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ محمود کو صرف ایک ثروت پسند اور جنگجو فرمانروا تصور کر لیا گیا ہے اور اس لئے اس سے علمی و ادبی قدردانی کی امید رکھنا اس کی شخصیت کے ساتھ ناانصافی کرنا خیال کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ اس کی ذات پر بہت بڑا ظلم ہے۔ محمود نہ صرف ایک ثروت پسند اور آزادہ رو بادشاہ تھا جیسا کہ عام طور پر اُس کو قرار دیا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس نے دل بہلانے اور تعریف کے خاطر عالموں، فاضلوں اور شاعروں کی قدر کی بلکہ وہ خود بھی ایک پایہ کا شاعر اور بلند مرتبہ عالم تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علما اور کاملین فن سے علوم شرعیہ کی تحصیل کی تھی۔ علامہ ابی الوفا القریشی المتوفی ۷۷۵ھ نے اسے ائمۂ فقہا میں شمار کیا ہے۔ حدیث و فقہ میں اُس نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک "کتاب التفرید" نہایت مشہور ہے اور فقہ احناف کی کتب مستندہ میں شمار ہوئی ہے۔ اس میں ساٹھ ہزار مسائل مذکور ہیں۔

محمود عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا۔ موسیو نے اپنی کتاب "منتخبات فارسی" (دیکھو کرسٹائی و بیرسال جلد دوم صفحہ ۲۵) میں "محمود نامہ" کو سلطان محمود غزنوی ہی سے منسوب کیا ہے۔ اگرچہ یہ غلط ہے لیکن محمود کے متفرق اشعار اب بھی موجود ہیں جنسے اس کے ایک اعلیٰ شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً بزم آرائے عنصری کی بیاض سے جو خود عنصری کے قلم سے لکھی ہوئی تھی محمود کی غزل مرقوم ہے:-[۱]

من گرد دل خویش ہوائے تو تنیدم	با مہر تو پیوستم و از خویش بریدم
دیگر ز بتاں چوں تو ندیدم ز پے آنک	بُت نیست بجائے کہ من انجا برسیدم
با من نخجند آن کہ چو او کس نہ گرفتم	نگرفت سر زلف تو ہر چند خچیدم
چون زلف شدم دست و جبہ تخانہ شامم	چون زلف تو کا دیدم وچوں روئے تو

[۱] ان معلومات کے مآخذ حسب ذیل ہیں:-
۵۳ شعر العجم شبلی نعمانی جلد اول صفحہ ۴۶
۵۲ باب الالباب محمد عوفی حصہ اول صفحہ ۲۹۳ تا ۲۹۴
۵۴ آثار الکرام مطبوعہ اردو صفحہ ۳۰۵

گفتم کہ یکے بندہ خریدم بدام من — نے نے غلط است ایں کہ خداوند خریدم

محمد عوفی نے شاہی شعرا میں محمود کا ذکر دوسرے نمبر پر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "غرض از تقریر ایں نصول آن ست کہ او را طبع شعر بودہ است"
(دیکھو لباب حصہ اول صفحہ ۲۴) گلستان نامی ایک کنیز بھی سلطان کو اس سے دلی محبت تھی جب اس کا انتقال ہوا تو محمود نے ذیل کا مرثیہ لکھا:-

چوں تو اے ماہ زیر خاک شدی — خاک را بر سپہر فضل آمد
دل جزع کرد گفتم اے دل صبر — این قضا از خدائے عدل آمد
آدم از خاک بود خاکی شد — ہر کہ زو زاد باز اصل آمد

سلطان محمود نے اپنی وفات کے قریبی زمانہ میں یہ نہایت مشہور قطعہ لکھا جسکو متاخر تذکرہ نویسوں نے اوروں کی طرف منسوب کردیا ہے:-

زبیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے — جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے
گہے بعز و بدولت ہمی نشستم شاد — گہے ز حرص ہمی رفتمی ز جائے بجائے
بسے تفاخر کر دم کہ من کسے ہستم — کنوں برابر بینم ہمی امیر و گدائے

....

ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست — بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد — بقا بقائے خدا ایست و ملک ملک خدائے[۵۱]

ان اشعار کو دولت شاہ نے سلطان سنجر سلجوقی سے منسوب کیا ہے۔

ایتھے[۵۲] کا خیال ہے کہ چھ غزلیں بھی محمود غزنوی سے منسوب پائی جاتی ہیں لیکن ان کے متعلق شبہ ہے کہ آیا وہ محمود غزنوی کی بھی ہیں یا نہیں؟ افسوس ہے کہ موجودہ تاریخوں سے کوئی ایسا ٹھوس مواد حاصل نہیں ہوسکتا جس کے ذریعہ سے ہم محمود کی ذاتی لیاقت اور ذوق علم کا صحیح اندازہ لگا سکیں اور اسپر کافی بحث کریں اگر ابوالفضل بیہقی کی تاریخ یمینی، یا مقامات محمودی یا تاریخ محمودی، تاج الفتوح، مقامات ابوالفر مشکان، تاریخ ملا محمد غزنوی اور تاریخ محمود وراق موجود ہوتیں تو ہم کو محمود کی ذات کے متعلق بہت کچھ معلومات دستیاب ہوتیں[۵۳] تاہم اب بھی کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ محمود خود بھی ایک شاعر اور عالم شخص تھا۔

محمود کی زندگی کے علمی و ادبی پہلو کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ سب سے پہلے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ عالموں شاعروں کا حقیقی قدردان نہ تھا بلکہ انھیں اپنی شہرت کے بھینٹ چڑھایا کرتا تھا۔ اس بارے میں پروفیسر براؤن جیسا محقق اور سنجیدہ مذاق رکھنے والا شخص بھی جادۂ اعتدال و انصاف سے ہٹ گیا ہے[۵۴]۔ محمود کی اس قسم کی طرز عمل کی مثال ابوریحان بیرونی کے اس واقعہ سے دیجاتی ہے

[۵۱] ماخوذ از تنقید شعر العجم محمود شیرانی۔ مطبوعہ اردو جلد دوم حصہ ہشتم صفحہ ۵۲۸ [۵۲] دیکھو براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۱۱۷
[۵۳] ان کتابوں کے لکھنے کے متعلق خود بیہقی نے اپنی تاریخ مسعودی میں ذکر کیا ہے اگرچہ وہ اب کہیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ دیکھو تاریخ بیہقی مصحح مارلے مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء۔ صفحات ۱۵۸۔ اور ۱۶۲ [۵۴] دیکھو لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحات ۹۵ اور ۱۵۲۔

جو چہار مقالہ کی ایک حکایت میں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

"یمین الدولہ سلطان محمد دین ناصر الدین شہر غزنیں بر بالائے کوشکے در چہار دری نشستہ بود بباغ
ہزار درخت روے با بوریحان کرد وگفت من ازیں چہار در از کدام در بیروں خواہم رفت حکم کن
واختیار آں بر پارۂ کاغذ نویس و در زیر نہالی کن نہ۔ وایں ہر چہار در راہ گذر داشت
ابوریحان اسطرلاب خواست وارتفاع بگرفت و طالع راست کرد وساعتی اندیشہ نمود و بر پارہ
کاغذ بنوشت۔ و در زیر نہالی نہاد۔ محمود گفت حکم کردی۔ گفت کردم۔ محمود فرمود تا کنندہ و
تیشہ وبیل آوردند، بر دیوارے کہ بجانب مشرق ست درے پنجمین بکندند و ازاں در بیروں
رفت وگفت آں کاغذ پارہ بیاوردند۔ بوریحان بروے نوشتہ بود کہ ازیں چہار در ہیچ بیروں
نشود بر دیوار مشرق درے کنند و ازاں در بیروں شود۔ محمود چوں بخواند طیرہ گشت۔ گفت اورا
میاں سرائے فرو اندازند۔ چناں کردند مگر بام میانگین دامے بستہ بود بوریحان براں دام آمد
ودام بدرید و آہستہ بر زمین فرود آمد۔ چنانکہ بروے افگار نشد۔ محمود گفت اورا بر آرید بر آوردند
گفت یا بوریحان ازیں حال باری ندانستہ بودی؟ گفت اے خداوند! دانستہ بودم۔ گفت دلیل کو؟ غلام را آواز داد
وتقویم از غلام بستد و تحویل خویش از میاں تقویم بیروں کرد۔ در احکام آں روز نوشتہ بود کہ مرا از جائے بلند بیندازند و
لیکن بسلامت بزمیں آیم وتندرست برخیزم۔ ایں سخن نیز موافق رائے محمود نیامد طیرہ تر گشت۔ گفت اورا بقلعہ باز دارید
اورا بقلعہ غزنین باز داشتند و شش ماہ دراں حبس بماند۔"

اسی کے سلسلہ میں ایک دوسری حکایت بھی پیش کی گئی ہے جسمیں محمود ابوریحان کو قید خانہ سے بلاکر معافی چاہتا ہے اور انعام واکرام سے سرفراز کرکے کہتا ہے کہ "یا بوریحان! اگر خواہی کہ از من برخوردار باشی سخن بر مراد من کو نہ بہ سلطنت علم خویش۔"

اس واقعہ کے صحیح یا جھوٹ ہونے کے متعلق فی الحال کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ ضرور ہے کہ یہ حکایت نہایت شک آمیز ہے اور اور بہت ممکن ہے کہ غلط ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں اس سے زیادہ غلط امور قلمبند کر دئے ہیں نہ صرف سنی سنائی باتوں اور قصہ کہانیوں بلکہ تاریخی امور میں بھی نظامی نے جگہ جگہ نہایت بے موقع اور لغو واقعات لکھے ہیں۔ مرزا محمد قزوینی نے چہار مقالہ (مطبوعہ گب میموریل سیریز) پر جو مقدمہ لکھا ہے اسمیں نظامی کی جن غلطیوں کو پیش نظر کر دیا ہے اُن کے کچھ نمونے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ نظامی نے کس قسم کی اہم تاریخی غلطیاں کی ہیں:۔

(۱) ابو القاسم علی بن محمد اسکافی نیشاپوری کو نوح بن نصر بن احمد سامانی کا وزیر لکھا ہے حالانکہ وہ اس کے دادا نوح بن نصر کا

وزیر تھا۔ اور اس کے جلوس سے بیس سال قبل ہی انتقال کر چکا تھا۔ (دیکھو چہار مقالہ صفحات ۱۳-۱۶-اور ۱۰۳)

(۲) الپتگین بانی خاندان غزنویہ کو متذکرہ بالا نوح بن منصور کا معاصر قرار دیا ہے حالانکہ وہ بھی نوح کے جلوس سے ایک عرصہ قبل ہی انتقال کر چکا تھا۔ (دیکھو صفحات ۱۳-۱۴، ۱۰۳ اور ۱۰۴)

(۳) یہ فرض کیا ہے کہ سبکتگین نے سجوریوں سے ملکر خراسان پر لشکر کشی کی اور الپتگین سے جنگ کی حالانکہ الپتگین اس واقعہ سے تقریباً بیس سال قبل ہی وفات پا چکا تھا اور اس وقت بھی خود سبکتگین نے سجوریوں سے جنگ کی تھی نہ کہ ان سے ملکر کسی اور کا مقابلہ کیا یہ نہایت مشہور تاریخی واقعہ ہے (صفحات ایضاً)

(۴) سامانیوں کے ایک مشہور سردار ابو علی احمد بن محتاج چغانی کو (علاوہ ان غلطیوں کے جو اس کے نام شہر اور منصب کے متعلق کی ہیں اور اُس کو ابوالحسن علی بن محتاج کسانی حاجب الباب لکھا ہے) نوح ابن منصور سامانی کا معاصر خیال کیا ہے حالانکہ وہ نوح کے جلوس سے بائیس سال قبل مر چکا تھا (صفحات ۱۴، ۱۰۴، ۱۰۵)

(۵) سامانیوں کے اس لشکر کے سردار کو جس نے ماکان بن کاکی سے جنگ کی اور اس کو مار ڈالا "تاش سپہ سالار" کے نام سے موسوم کیا ہے حالانکہ تمام مورخین اسپر متفق ہیں کہ اس جنگ میں ابو علی بن محتاج چغانی سپہ سالار تھا (صفحات ۱۵، ۱۶، ۱۰۶)

(۶) حسن بن سہل کو اُس کے بھائی فضل بن سہل سے ملا دیا اور حسن کو ذوالریاستین لکھا ہے حالانکہ یہ اس کے بھائی فضل کا لقب تھا۔ پوران زوجۂ مامون رشید کو فضل بن سہل کی دختر قرار دیا ہے حالانکہ وہ اس کے بھائی حسن بن سہل کی لڑکی تھی (صفحات ۱۹، ۱۰۹، ۱۱۰)

(۷) سلطان مسعود سلجوقی اور سلطان سنجر میں اشتباہ کر دیا ہے۔ اور المسترشد باللہ کی لشکر کا مقصد سلطان سنجر سے جنگ کرنا قرار دیا حالانکہ تمام مورخین اسپر متفق ہیں کہ المسترشد سلطان مسعود سے جنگ کرنے نکلا تھا نہ کہ سلطان سنجر سے (صفحات ۲۱-۲۲، ۱۱۷)

(۸) ایلک خان کو جو ماوراء النہر کے ملوک خانیہ سے تھا بغراخاں کے نام سے یاد کیا ہے اور بغراخاں کو سلطان محمود کا معاصر قرار دیا ہے حالانکہ اس کا معاصر ایلک خاں تھا (صفحات ۲۴-۲۵، ۱۲۱-۱۲۳-)

(۹) مسعود سعد سلمان کے متعلق کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں جنکے متعلق مرزا محمد قزوینی نے حواشی میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے (صفحات ۴۴، ۴۵، ۱۶۸-۱۸۲)

(۱۰) ایک جعلی شخصیت موسوم بہ امیر شہاب الدین قتلمش الب غازی (دیکھو صفحہ ۴۵) کا جہاں ذکر کیا ہے تو ایک دو سطروں ہی میں پانچ سات ایسی غلطیاں کر دی ہیں کہ اُن کی اصلاح ناممکن سی معلوم ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ مصنف نے اُس کو اپنے ذاتی تجربہ کے طور پر لکھا ہے۔

(۱۱) یعقوب ابن اسحٰق کندی کو جو فیلسوف عرب کے نام سے مشہور ہے، جسکے آباؤ اجداد مشہور ترین مسلمانوں میں سے اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس

کے مقتدر حاکم اور عامل تھے اور جن کے جد امجد اشعث بن قیس حضرت رسول خدا صلعم کے صحابہ میں سے تھے یہودی قرار دیا ہے اور اسی بیہودہ بنیاد پر ایک طویل حکایت لکھی ہے جو اول سے آخر تک غلط اور لایعنی باتوں سے بھری ہوئی ہے (دیکھو صفحہ ۵۵ - ۵۶، ۲۰۳، ۲۰۴)

(۱۲) خواجہ نظام الملک طوسی کا قتل بغداد میں ظاہر کرتا ہے حالانکہ وہ نہاوند میں قتل ہوا - (دیکھو صفحہ ۶۶ اور ۲۶۰)

(۱۳) مشہور سلمان طبیب محمد بن زکریا رازی کو منصور بن نوح سامانی کا وزیر لکھدیا ہے حالانکہ وہ منصور کے سنہ جلوس سے تقریباً تیس سال قبل وفات پا چکا تھا - اسی باطل بنیاد پر ایک بڑی حکایت لکھی ہے جو سرتا پا بیہودگیوں سے معمور ہے (صفحات ۴۳، ۴۷، ۲۴۵، ۲۵۱)

(۱۴) ابو علی ابن سینا کو علاء الدولہ کا وزیر قرار دیا ہے حالانکہ وہ شمس الدولہ کا وزیر تھا اسی طرح اسی کا مقام وزارت ہمدان قرار دیا ہے حالانکہ وہ رے میں وزیر ہوا تھا۔

غرض جس شخص نے مشہور تاریخی واقعات کے متعلق اس قدر فاش غلطیاں کی ہیں (جن میں سے بعض کو وہ اپنا ذاتی تجربہ بھی قرار دیتا ہے) اس سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ ابو ریحان کے واقعہ میں صحت کا لحاظ رکھتا بہت ممکن ہے کہ ابو ریحان یا کسی دوسرے حکیم یا منجم کے ساتھ کسی اور بادشاہ نے اس قسم کا سلوک کیا ہو اور نظامی تک روایت اس طرح پہونچی ہو یا خود اس نے اس کو اس طرح لکھدیا ہو۔

دوسرے قسم کا اعتراض جو محمود پر کیا جاتا ہے وہ اس کا بخل ہے - اس کے متعلق ابن اثیر نے چند پر لطف قصے نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے کردار میں صرف ایک چیز خراب ہے جو اس کا لالچی اور بخیل ہونا ہے - اسی قسم کے اعتراض میں فردوسی کا مشہور عالم فسانہ بھی آجاتا ہے - لیکن متذکرہ بالا قصہ کی طرح فردوسی کے واقعہ کے متعلق بھی کوئی قطعی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا - یہ بات ضرور ہے کہ فردوسی محمود کے دربار سے نامراد واپس گیا۔

اس کا اصلی سبب محمود غزنوی کا بخل تھا یا یہ قصہ بھی پہلے قسم کے اعتراضوں میں شامل ہے اس کی نسبت کسی ایک رائے تک پہونچنے کے لئے ہماری موجودہ معلومات ناکافی ہیں اگر بفرض محال ہم ان دونوں قصوں کو صحیح بھی تسلیم کریں تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا محمود کے عام کردار اور علمی احسانات پر کیا اثر پڑ سکتا ہے

اگر اسوقت ہمارے علمی ذخیرہ میں محمود کے زمانہ کی تاریخیں محفوظ رہتیں تو ہم محمود کی فیاضی، سرپرستی، علوم و فنون اور قدردانی شعرا کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تاہم اس قسم کی جس قدر بھی معلومات ہمیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہی کے ذریعہ سے ہم یہاں محمود کے متعلق اعتراضات پر بحث کریں گے۔

(۱) ابو الفضل بیہقی نے ابو الخیر خمار نصرانی کے متعلق لکھا ہے کہ "سلطان محمود با او در نہایت اکرام و غایت تجلیل اختیار نمود بحدیکہ گویند زمین را در مقابل او بوسید" تعجب ہے کہ محمود ایک نصرانی حکیم خمار کی تو اس قدر قدر و منزلت کرے اور ابو ریحان اور فردوسی کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آئے۔

(۲) غضائری غزنین آنے سے پہلے جب بہاء الدولہ بویہ کے دربار میں تھا تو ہر سال محمود کی خدمت میں ایک قصیدہ روانہ کیا کرتا تھا جس کے صلہ میں محمود اس کو ایک ہزار دینار عطا کیا کرتا تھا۔

(۳) ایک دفعہ محمود کی فرمائش غضائری نے ایک رباعی لکھی جس کے صلہ میں سلطان نے دو ہزار دینار عنایت کئے اُسکے بعد غضائری نے ایک غزل پڑھی جو سلطان کو پسند آئی اور اس نے صلہ کو المضاعف کر دیا۔ اس عنایت کے شکریہ میں غضائری نے ایک مطول قصیدہ لکھا جسکا مطلع یہ ہے:۔

اگر مراد بجاہ اندرست وجاہ بمال   مرا ببیں کہ ببینی جمال را بکمال

فرشتہ لکھتا ہے کہ جب یہ قصیدہ سلطان کے ملاحظہ میں پیش ہوا تو اس نے چودہ ہزار درم بھر عنایت کئے۔ اس عطیہ بے کراں کو دیکھ کر عنصری نے بے حد پیچ وتاب کھایا اور اسی قصیدہ کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے

خدائگان خراسان وآفتاب کمال   کہ وقف کرد براو ذو الجلال عز وجلال

سلطان نے عنصری کو بھی اسی قدر رقم عنایت کی۔

(۴) عنصری کی بھی سلطان نے خاصی قدر و منزلت کی۔ ملک الشعرا کا خطاب دیکر دربار کے شاعروں کا افسر مقرر کیا اس کے جاہ وجلال اور دولت و ثروت کا یہ حال تھا کہ مشہور ہے کہ اس کا کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پکتا تھا اور جب وہ مکان سے باہر نکلتا تھا تو چار سو زرین کمر غلام اس کے ہمرکاب رہا کرتے تھے۔

(۵) چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ عنصری نے جب یہ رباعی سلطان کے سامنے جاکر پڑھی ؎

کے عیب سر زلف بت از کاستن است   چہ جائے بغم نشستن وخاستن است

جائے طرب ونشاط ومے خواستن است   کار استن سرو ز پیراستن است

تو سلطان کا سارا غم دور ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ تین بار عنصری کا منہ جواہرات سے بھرا جائے۔ (دیکھو صفحات ۴۴-۴۵)

(۶) عنصری کی طرح فرخی بھی سلطان کی بزم ادب میں اس قدر سرفراز ہوا کہ جب باہر نکلتا بیس زرین کمر غلام اس کی سواری کے جلوس میں چلا کرتے تھے۔

---

[۱] غضائری کو جو انعامات محمودی دربار سے حاصل ہوئے ہیں ان کی تفصیل خزانہ عامرہ میں مذکور ہے۔

(۷) ۴۱۳ھ میں سلطان محمود نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے راجہ نندا نے ۳۰۰ ہاتھی دیکر صلح کرلی اور ہندی زبان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھکر سلطان کی خدمت میں روانہ کیا دربار میں ہند اور عرب و عجم کے جو علما تھے انھیں سلطان نے یہ قصیدہ سنایا سبھوں نے اس کی تعریف و توصیف کی تو سلطان نے اُس کے صلہ میں نندا کے تمام علاقے واپس کردئے اور علاوہ اس کے چودہ قلعوں کو اپنی طرف سے اُسے دیدیا۔[۱]

(۸) محمود کی "پیل بار انعام بخشیاں" ضرب المثل کے طور پر ہوگئی تھیں۔ وہ ہاتھی بھر بھر کر انعامات دینے کا عادی تھا۔ فارسی شاعری میں ایسی تلمیحیں موجود ہیں جن میں سلطان محمود کے انعامی ہاتھیوں کا ذکر آتا ہے نظامی فرماتے ہیں[۲]

مرا پیل بار از تو مقصود نیست　　　که پیل تو چوں پیل محمود نیست

عضائری ایک موقع پر رقمطراز ہے

امید دارم کس بار صد ہزار تمام　　　بمن بیارد و بر پائے پیل بر قتیاں

ایک دوسری جگہ عضائری لکھتا ہے

مراد بیت بفرمود شہریار جہاں　　　براں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال

دو ہدرہ زر بفرستاد دو ہزار درم　　　بہ غم حاسد و تیمار بدسگال نکال

خاقانی عنصری کی دولتمندی کا ذکر کرتا ہے

شنیدم که از نقره زد دیگداں　　　ز زر ساخت آلات خوان عنصری

انوری کہتا ہے

چند گوئی عنصری راشعر نیکو آمده ست　　　دولت محمود بود ست آن نه طبع عنصری

(۹) سلطان محمود اپنے دربار کے شعرا پر سالانہ چار لاکھ دینار صرف کیا کرتا تھا۔ ہر نئے شاعر کو اس کے دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دیجاتی تھی وہ شاعروں کو دیکھکر خوش ہوتا تھا۔ فرخی کہتا ہے

تو از دیدار ماہم ہمچناں شاداں شوی شاہا　　　که ہرگز نیم از اں وامق نگشت از دیدن عذرا

طواف شاعراں بینم بگرد قصر تو ہر دم　　　ہمانا قصر تو کعبہ ست و گر د قصر تو بطحا

کیا فیاضیوں کے ایک ایسے ناپید اکراں بحر مواج سے تشنہ لب جانا فردوسی کی بدقسمتی نہیں ہے؟

محمود کے نزدیک۔ اس محمود کے نزدیک جس نے ابر نیساں بنکر شاعروں پر لکھو کھا اشرفیوں کی بارش کی ــــــ ساٹھ ہزار اشرفیاں

[۱] ماخوذ از آثار الکرام صفحہ ۲۰۹ جہیں تاریخ فرشتہ اور طبقات اکبری سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔
[۲] دیکھو تنقید شعر العجم محمود شیرانی مطبوعہ اردو

دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن جب فردوسی کا ظرف قسمت ہی ایسا نہ ہو کہ ان کو حاصل کر سکے تو اُس کا کیا علاج؟ یہ بھی دنیائے ادب کا ایک معمہ ہے کہ معمولی سے معمولی شاعر تو لکھو کھا روپے انعاموں میں حاصل کریں اور فردوسی جیسا زبردست شاعر اور رزمیہ نگار قطعاً محروم رہ جائے لیکن کیا صرف ایک بدقسمت فردوسی کے قصہ کو چمکانا اور محمود کی دوسری تمام فیاضیوں کو تاریکی میں رکھنے کی کوشش کرنا اور اس امر کا دعویٰ کرنا کہ محمود بخیل اور حریص تھا، انصاف کا خون کرنا نہیں ہے؟

محمود بالطبع حریص سہی بخیل سہی، لیکن اُس نے عام شاعروں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ فردوسی کے ساتھ بھی سلوک کر سکتا تھا لیکن نہ معلوم کونسا ایسا منحوس واقعہ تھا کہ فردوسی کو اس کی بارگاہ سے مایوس جانا پڑا اور اس کی باعث محمود کی مخالفت میں خیالات پھیلانے والوں کو ہمیشہ کے لئے موقع مل گیا کہ وہ اس کو برا کہہ کر اس کی علمی و ادبی خدمات سے اس کی زندگی کے عظیم الشان کارناموں کو محروم کر دیں۔

اگر محمود دراصل شاعروں اور عالموں کا قدر دان نہیں تھا اور اگر اس نے اپنے دربار میں ان کے ساتھ برا برتاؤ کیا تھا تو کیا آج سوائے چہار مقالہ کی ایک مشکوک روایت کے جو البیرونی کی نسبت ہے اور کیا سوائے اس طشت از بام افسانہ کے جو فردوسی سے متعلق ہے ہمیں اس کی ناقدردانی اور بدسلوکی کی کوئی اور مثال ہمدست نہو سکتی کیا اس کے مخالفین جنھوں نے اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے ان دو قصوں کے علاوہ اس قسم کے اور واقعات ثبوت کے لئے نہیں پیش کر سکتے تھے۔ اگر انہیں کہیں بھی ذرا سا ان امور کی طرف اشارہ نظر آتا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اُس کو اجاگر کر کے محمود کی برائیوں کا ایک زبردست قلعہ تعمیر کر دیتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ محمود کی عالمگیر فیاضیوں اور قدردانیوں نے اس امر کا کہیں موقع نہیں دیا۔

اگر محمود علم و ادب کا حقیقی قدردان نہ ہوتا اور البیرونی کے شک آمیز واقعہ کے مطابق وہ اپنے دربار میں علما و فضلا کو ذلیل کیا کرتا تو کیا اُس کے بعد کے مصنفین اس امر کی طرف کہیں بھی اشارہ نہ کرتے؟ اس قسم کی شکایت کے برخلاف جب ہم محمود کے بعد کی چند تاریخوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں حسب ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں:۔ (۱) محمد عوفی۔ لباب الالباب میں محمود کی جہانگیری اور کشور کشائی وغیرہ کے ذکر کے بعد لکھا ہے:۔

" با این ہمہ مشاغل از تربیت علما و اماثل ہیچ دقیقہ اہمال نکردے و بجا درت ایشاں رغبت صادق داشتے و بمجاورت ایشاں استیناس جستے و شعرا را صلات فاخر و جواہر سنی فرمودے تا لاجرم ہر یک بقدر وسع و طاقت خود ذکر جمیل و نام نیک او را مخلد گردانیدند و بنظم و نثر تازی و پارسی در محامد و مآثر او دفترہا ساختند (دیکھو جلد اول صفحہ ۲۴)

(۲) حمد اللہ مستوفی اپنی تاریخ گزیدہ میں محمود کے متعلق رقمطراز ہے:۔

" مآثر او از آفتاب روشن تراست و مساعی او در روزگار از شرح و وصف مستغنی کتاب یمینی و مقامات

ابو نصر مشکان و مجلدات ابوالفضل شیبانی شاہد حال اوست۔ علما و شعرا را دوست داشتے و در حق ایشاں عطاے خبر یل فرمودے۔ ہر سال زیادت از چہار صد دینار اور ایدین جماعت صرف شدے (دیکھو صفحہ ۳۹۵)

(۳) مجمع الفصحا میں محمود کے متعلق لکھا ہے:۔

چون دولت ملوک آل ناصر غزنویہ بلند آوازہ آمد سلطان محمود بن ناصر الدین سبکتگین در تربیت شعرا کوشیدہ و بہ تکمیل مستعدان عہد جہد کرد چنانکہ ثروت حکیم ابوالقاسم عنصری از دولت عبداللہ رودکی درگذشت و چہار صد تن شاعر ماہر نادر دران والا دولت تربیت یافتند" (دیکھو جلد اول ذکر محمود)

(۴) سلطان کی علم دوستی کے متعلق بحر القواعد میں جو نصف قرن ششم ہجری کی فارسی زبان میں ایک تصنیف ہے اور ملک شام میں آتابک ابی سعید ارسلان کے لئے لکھی گئی ہے روایت ذیل مرقوم ہے:۔

سلطان غازی محمود سبکتگین گفت ہمہ مرادہاے جہاں در جہاں یافتم مگر یک آرزو در تہا خواندن خبرہاے گذشتگاں دانستن پس بفرمود تا در شہر غزنین کتب خانہ بساختند چوں شب در آمدے علما را جمع کردے تا میخواندندے" (ماخوذ از تنقید شعر العجم مطبوعہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۵۲۵)

(۵) سلطان محمود کے انتقال کے بعد فرخی نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ بھی یہاں نقل کئے جانے کے قابل ہے کیونکہ وہ ایک دل کی پرخلوص صدا ہے جو اپنے محسن کی وفات سے متاثر ہونے کے بعد بغیر کسی خاص غرض کے اس سے ظاہر ہوئی ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی در حقیقت شعرا کا کس قدر سرپرست و مربی تھا اور وہ اس کو کس درجہ دل سے محبت کرتے تھے۔ بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

شہر غزنین نہ ہماں است کہ من دیدم پار | چہ فتاد است کہ امروز دگر گوں شد کار
کوچہا بینم پر شورش و سرتاسر کوے | ہمہ پر جوشن و جوشن در و بر خیل و سوار
مہتراں بینم بروے زناں ہچو زناں | چشمہا کردہ ز خوں نابہ برنگ گلنار
ملک امسال دگر بار نیامد ز غزا | دشمنے روے نہاد است در یں شہر و دیار
سیر نیخورد و مگر دی کہ بخفتہ ست امروز | دیر تر خواست مگر بیچ رسید ش ز خمار

خیز شاہا کہ رسولان شہاں آمدہ اند — ہدیہا دارند آوردہ فراوان دثار

کہ تو اندکہ برانگیزد ازیں خواب ترا — خفتنی فتنۂ گز خواب نگردی بیدار

خفتن بسیار اے خواجہ خوے تو نبود — ہیچ کس خفتہ ندیدا ست ترا زیں کردار

شعرا را تو بازار برافروختہ بود — رفتی و با تو بیکبارہ برفت آں بازار

(۶) جب سلطان علاء الدین حسین غوری نے اپنے دو بھائیوں، قطب الدین محمد اور سیف الدین سوری کے خون کا بدلہ لینے کے لئے غزنین پر حملہ کرکے اُس کو تاخت و تاراج کر دیا اور تمام غزنوی حکمرانوں (سوائے محمود مسعود اور ابراہیم) کی لاشوں اور قبروں کو اُکھاڑ پھینکا، اور محمودی نشانیوں کو ملیامیٹ کر دیا تو اس وقت فرط جوش میں اُس کی زبان پر یہ اشعار جاری تھے جو فردوسی نے محمود کی مدح میں لکھے تھے [۵]

چو کودک لب از شیر مادر بشست — ز گہوارہ محمود گوید نخست

بہ تن زندہ پیل و بجاں جبرئیل — بکف ابر بہمن بدل رود نیل

جہاندار محمود شاہ بزرگ — بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ

ایسے نازک موقع پر جبکہ بھائیوں کے خون کے انتقام کے لئے علاء الدین سراپا آگ بنکر جہانسوزی میں مشغول تھا اپنے دشمنوں کے بادشاہ اور اپنے بھائیوں کے قاتل کے دادا کو اس طرح بار بار یاد کرنا سوائے سلطان محمود کی علمی اقبالمندی کے ثبوت کے اور کوئی بات نہیں۔

محمود کی علمی و ادبی قدردانیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے اور اس کے متعلق بعض مشہور مصنفین کے خیالات پیش کرنے کے بعد اب ہم محمودی عہد کے ان کارنمایاں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے فارسی نظم و نثر میں کافی اضافہ ہوا، جن کے باعث ادبیات ایران ہمیشہ محمود کی مرہون منت رہینگی اور جن کے معلوم کرنے کے بعد محمود کی حقیقی علمی خدمات کا صحیح نقش ہمارے ذہنوں پر مرتسم ہو سکتا ہے۔

(۱) سلطان محمود نے اپنی بزم کے ایک رکن محمد بن محمود البدایعی سے فرمائش کرکے نصیحت نامہ نوشیرواں کو بحر تقارب میں منظوم کرایا۔ یہ کتاب اس وقت کمیاب ہے۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس کے متفرق اشعار نقل کئے ہیں۔

(۲) سلطان محمود ہی کے دربار کے ایک اور فرد منشوری نے صنعت ملون کو مختصر کیا۔ اس کا ذکر رشید الدین وطواط نے حدائق السحر میں کیا ہے۔ خورشیدی نے منشوری کی شرح لکھی ہے جس کا نام کنز الغرایب [۵] ہے۔

(۳) سلطان محمود کے دربار کے ایک بڑے شاعر فرخی نے صنایع بدایع فارسی کے متعلق نثر میں ایک کتاب ترجمان البلاغت لکھی جو اس وقت ناپید ہے۔ رشید الدین وطواط نے اُسے دیکھا تھا۔

[۵] اس حصۂ مضمون کی بعض معلومات آثار الکرام حکیم شمس اللہ قادری سے ماخوذ ہیں۔

پریم کی چوڑیاں

:- فسانہ :-

نورپور گنگاجی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، پنڈت گردھاری لال اس گاؤں کے زمیندار تھے رماشنکر اُن کا اکلوتا لڑکا تھا۔ کھیتی باڑی میں بڑی برکت تھی، گھر میں غلہ کا انبار لگا تھا کسی بات کی کمی نہ تھی۔ پنڈت گردھاری لال کا لڑکا رام جیاون ذات کا برہمن تھا کسی زمانے میں اُس کے خاندان میں بھی لکشمی دیوی کا راج تھا۔ لیکن غدر میں اس کا خاندان تباہ ہوگیا جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ یتیم تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے اُس کی پرورش کی اور بڑے ہوتے ہی اپنے یہاں پیادوں میں نوکر رکھ لیا۔ رام جیاون بڑا کسرتی پہلوان تھا گو اب اس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی پھر بھی نورپور کا تو کیا ذکر آس پاس کے گاؤں میں بھی اس کی جوڑ کا کوئی دوسرا پہلوان نہ تھا۔ پنڈت گردھاری کے یہاں چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ پھر فصل میں دس بارہ من اناج بھی مل جاتا تھا۔ گھر میں ایک اچھی ذات کی گائے تھی اس کے لئے بھوسہ وغیرہ اسامیوں سے مل جاتا تھا۔ جب پنڈت رام جیاون اکھاڑے میں ڈنڈ پیل کر صبح کو اپنی گائے کا تازہ دودھ پی کر لمبی پگڑی باندھے ہوئے اور الہ آبادی موٹی لاٹھی کندھے پر رکھکر گاؤں میں اسامیوں سے لگان وصول کرنے چلتے تو رعب چھا جاتا جو کام اور کسی پیادہ سے نہ ہوتا تو اسے رام جیاون مہاراج کے سپرد کیا جاتا۔ گھر میں اُن کی بیوی درگا اور ایک لڑکی پریم پیاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

رماشنکر اور پریم پیاری میں ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ رماشنکر کی پیدائش کے ایک سال کے بعد رام جیاون مہاراج کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی تو رماشنکر کی ماں تلسی نے لڑکی کا نام پریم پیاری رکھا۔ گاؤں میں ایسے نام کم رکھے جاتے ہیں لیکن زمیندارن کا نام رکھا ہوا کوئی کیسے بدلتا پھر بھی پریم پیاری کو لوگ پیار میں پریما کہنے لگے۔

رماشنکر اور پریما بچپن ہی سے ایک جگہ اُٹھے بیٹھے کھیلے کودے اور گروجی کے یہاں ایک ساتھ پڑھے بھلا اُنہیں محبت کیوں نہ ہوتی۔ صبح کے وقت خاک دھول میں لت پت ہو کر گھروندے بنانا دونوں کا ایک نہایت ہی پُر لطف کھیل تھا پریما جب گڑیا گڈے کا کھیل کھیلتی تو رما بھی اس میں حصہ لیتا۔ ساون کے مہینے میں جب رم جھم برکھا کی بہار آتی اور نورپور کے پُر فضا میدان میں گنگاجی کے کنارے گڑیوں کا میلا لگتا تو گڑیاں اپنے سسرال جاتیں پریما ہاتھ پاؤں میں مہندی رچاتی اپنی گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجا کر بدا کرتی گنگاجی کے کنارے جاتی تو رما بھی ساتھ جاتا اور جب پریما اپنی خوبصورت

گڑیوں کو پانی میں پھینکتی تو راما اپنی خوش رنگ نیم کی چھڑی سے پریما کی گڑیوں کو پیٹتا اور خوب خوش ہوتا۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کھیل ہی کھیل میں دونوں میں لڑائی ہوئی گوسا کاٹا مارا پیٹا اور پھر تھوڑی دیر میں ملاپ ہوگیا۔ پریما کے روٹھنے پر راما اُس کی دلجوئی کرتا اور جب راما بگڑتا تو پریما اُسکو منالیتی۔ اسی طرح ہنسی خوشی میں بچپن کا کھیل ختم ہوگیا اور دونوں نے بہار عمر کے سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا۔ پنڈت گردھاری لال کے ایک چچیرے بھائی گلزاری لال الہ آباد میں وکیل تھے انھیں کے پاس راما کو انگریزی پڑھنے کے لئے پنڈت جی نے بھیجدیا۔ الہ آباد جانے سے پہلے جب راما پریما سے ملا تو پریما نے کہا۔ راما دیکھو الہ آباد جاکر مجھے بھول نہ جانا

"پریما تیرا کدھر خیال ہے بھلا میں تجھے بھول سکتا ہوں۔ میں جب الہ آباد سے آؤنگا تو تیرے لئے بڑی اچھی اچھی چیزیں لاؤنگا۔"

"الہ آباد سے کب آؤگے؟"

"مہینے میں ایک مرتبہ ضرور آؤنگا"

جب راما رخصت ہونے لگا تو اُس نے دیکھا کہ پریما کی کنول کی سی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ اس نے کہا پریما تو روتی کیوں ہے پریما نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اس نے جلدی سے اپنے آنچل سے آنسو پونچھ ڈالے اور پھر بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر کے اندر بھاگ گئی

راما جب نور پور ایسے چھوٹے گاؤں سے نکل کر الہ آباد ایسے بڑے شہر میں پہنچا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اپنے چچا کی عالیشان کوٹھی دیکھکر راما کی نظر میں اپنے نور پور والے کچے مکان کی کوئی وقعت نہ رہ گئی۔ اس کا الہ آباد میں اتنا جی لگا کہ وہ عرصہ تک نور پور نہ گیا اپنے نئے دوستوں سے مل کر وہ پریما کو بھول گیا۔ اس کے چچا نے اس کے لئے کوٹ۔ پتلون اور انگریزی جوتا بنوادیا۔ وہ ٹمٹم پر سوار ہوکر شام کو خسرو باغ کی سیر کرتا۔ ادہر تو راما شہر کی دلچسپیوں میں اپنی دیہاتی زندگی کو محو کئے تھا اور ادہر نور پور میں پریما اس کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی۔ وہ روز شام کی ڈھلتی ہوئی چھاؤں میں اپنے گھر کے سامنے چبوترہ پر بیٹھکر راما کی راہ دیکھا کرتی۔ بھنگ اور دھمنی کے جھیموں سے جو قدرتی راگ پیدا ہوتا وہ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی اس کو مسرور نہ کرسکتا۔ برسات کے موسم میں جب کالی بھنور راتیں سر پر ہوتیں۔ بجلی چمکتی بادل گرجتا۔ مور جھنگارتے۔ جھینگر الاپتے تو راما کی یاد میں پریما کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح جھڑیاں لگادیتیں۔

خدا خدا کرکے گرمیوں کی چھٹیوں میں پورے ایک سال کے بعد راما الہ آباد سے واپس ہوا جسوقت وہ گاؤں میں پہنچا دن ڈوب رہا تھا۔ گائیں اور بھینسیں چراگاہ سے واپس ہو رہی تھیں۔ سورج دیوتا کی سنہری شعاعوں میں گائیں رنگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گنگا جی میں چمکتے ہوئے تارے گوالے "برہا" گاتے ہوئے چلے آرہے تھے کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ گاؤں کی بہوویں گھڑے لئے گنگا جی سے پانی بھرنے جارہی تھیں ان میں سے ایک شوخ اور چنچل عورت نے گھونگھٹ کی اوٹ سے راما کو دیکھکر اپنی ایک سہیلی سے کہا "اری! دیکھ تو یہ کون کرسٹان کا بچہ آگیا ہے؟"

اس کی سہیلی نے غور سے راما کو دیکھکر کہا "یہ تو راما ہے کیا تو نہیں جانتی یہ ہمارے زمیندار کا لڑکا ہے"

ارے یہ وہی راما ہے جو دہوتی کرتا پہنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ مٹی میں کھیلتا پھرتا تھا میں نے بالکل نہیں پہچانا تھا اور پہچانتی کیسے آج تو یہ انگریزی کپڑے پہن کر آیا ہے۔

دیہاتی زندگی میں ایک برادرانہ انس ہوتا ہے جو شہری زندگی میں نہیں پایا جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے امیر وغریب سب اسی رشتہ میں بندھے رہتے ہیں چنانچہ راما کے آنے کی خبر پاکر جگدیو لہار۔ بھلی بنیا۔ رمضان جلاہہ۔ جگروا دہوبی۔ کالکا کاچھی۔ ادھین اہیر۔ رام جیاون مہاراج وغیرہ راما کو دیکھنے آئے اور دعا دیکر چلے گئے۔

گاؤں میں پہنچکر راما کو پریا یاد آئی رات تو کسی طرح سے اُس نے بسر کی لیکن صبح اُٹھتے ہی وہ اس کے مکان پر پہنچا۔ رام جیاون گنگا اشنان کرنے گئے ہوئے تھے درگا دہان کوٹ رہی تھی۔ راما نے کہا " موسی! پرنام "

" کون! راما! جیتے رہو بھیا بھگوان تمھیں بنائے رکھیں۔ آؤ۔ آؤ اچھے تو ہے " یہ کہتی ہوئی درگا نے آواز دی۔ پریا! ارے او پریا۔ دیکھ تیرے راما بابو آئے ہیں ان کو بیٹھنے کے لئے کچھ آسن تو دے " راما چوکے میں دودھ گرم کر رہی تھی۔ ماں کی آواز سنکر وہ جلدی سے اٹھی اور ایک کھٹولہ لاکر بچھا دیا۔ راما کو خیال تھا کہ پریا سامنے آتے ہی خوب کھل ملکر باتیں کرے گی اس سے الہ آباد کا حال پوچھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پریا بدن چرائے آنکھیں نیچے کئے ہوئے آئی اور کھٹولہ بچھاکر پھر چوکے میں واپس چلی گئی راما نے درگا سے کہا " موسی! پریا بھاگ کیوں گئی مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی "

درگا نے چلاکر کہا۔ پریا کہاں چلی گئی ذرا ایک گلاس دودھ اور ملائی تو ڈالکر بھیا کو کھلا دے (ہنسکر) پریا بڑی بگلی ہے تم کو جو سال بھر کے بعد دیکھا ہے تو سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے۔ دیہاتی لڑکیاں بڑی ناسمجھ ہوتی ہیں "

راما " موسی میں بھی تو دیہاتی ہوں "

درگا " بھیا تمھاری اور بات ہے تمھارا اور پریا کا مقابلہ ہی کیا۔ تم پڑھے لکھے ہو لیکن پریا تو بالکل گنوار ہے۔ بس وہی تمھارے ساتھ گروجی سے کچھ ہندی کتابیں پڑھی تھیں کیا اتنے ہی سے وہ سمجھدار ہوگئی۔ نہیں بھیا نہیں وہ بڑی جاہل ہے، دیکھو نہ کئی مرتبہ پکار چکی ہوں لیکن ابھی تک دودھ لیکر نہیں آئی "

راما نے اٹھکر کہا " اچھا تو موسی میں خود ہی اس کے پاس جاتا ہوں دیکھوں تو وہ مجھ سے کیسے نہیں بولتی ہے " یہ کہتا ہوا راما چوکے میں گھسا اور درگا ہنس ہنس کر لوٹ گئی " ہاں بھیا ہاں تو ضرور پریا کو ٹھیک بنائے گا " یہ کہتی ہوئی درگا نے پھر اپنا موسل اٹھایا اور دہان کوٹنے لگی۔ جب راما چوکے میں پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ پریا ایک گلاس میں دودھ لئے ہوئے سر جھکائے چپ چاپ کھڑی ہے راما نے ہنسکر کہا " اوہو! ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے پہچانتی ہی نہیں کہو اچھی تو رہیں " پریا نے دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور ایک لٹیا میں جل بھر کر راما کے سامنے رکھدیا اور پھر دیوار کا سہارا لیکر ایک طرف کو چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ لیکن کن انکھیوں سے راما کو

دیکھتی جاتی تھی۔
راما نے کہا۔ "نہ۔نہ پریما اس طرح سے کام نہیں چلیگا جب تک تم مجھ سے نہ بولوگی میں تمھارے یہاں کی کوئی چیز نہ کھاؤں گا
تھوڑی دیر انتظار کر کے جب راما نے دیکھا کہ اس کا بھی کوئی جواب پریما نے نہیں دیا تو اُس نے اداس ہو کر کہا۔ اچھا پریما نہ بولو
جب تم میری بات کا کوئی جواب نہیں دیتیں تو میں اب جاتا ہوں یہ کہتا ہوتا راما اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت لجائی ہوئی پریما نے ایک
عجیب انداز سے کسمسا کر دھیمی آواز میں کہا" ہائے راما۔ تم تو نہ جانے کیا کہتے ہو"۔
راما کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پریما کی پیاری آواز نے اُس کا غنچۂ دل کھلا دیا۔ اب اس نے دو دھ پی لیا اور ہنستا ہوا چوکے سے
باہر نکل کر کہنے لگا۔ "موسی آخر کار میں نے پریما سے بات چیت کر ہی لی اس کی ضد میں نے توڑ دی"۔ درگا نے خوش ہو کر کہا" وہ
تمھارے ساتھ بچپن سے کھیلتی آئی ہے کہاں تک شرما سکتی تھی"۔
گھر سے باہر نکلتے ہوئے راما نے کہا" اوہو میں ایک بات بھول ہی گیا۔ موسی یہ دیکھو میں پریما کے لئے ایک جوڑہ چوڑیوں کا لایا ہوں۔ پریما
کو دیدینا"۔ چوڑیوں کو دیکھکر درگا بہت خوش ہوئی۔ چوڑیاں تھیں تو کانچ کی لیکن اس قسم کی قیمتی اور خوبصورت چوڑیاں اُسوقت تک گاؤں
میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھیں۔
درگا کے بلانے پر پریما چوکے سے باہر نکلی" دیکھ راما تیرے لئے کتنی خوبصورت چوڑیاں لایا ہے"۔ یہ کہتے ہوے درگا نے چوڑیاں پریما
کی طرف بڑھائیں۔ پریما نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُن کو لے لیا اور دزدیدہ نگاہوں سے راما کی طرف دیکھا۔ زبان سے تو اُس نے کچھ
نہ کہا لیکن شرمیلی آنکھوں نے سوال کیا" کیوں جی یہ چوڑیاں کانچ کی ہیں یا پریم کی ؟ "
راما نے بھی اس کا مطلب سمجھ لیا اور اشاروں میں جواب دیا" یہ پریم کی چوڑیاں ہیں"
آسمان نے کروٹیں لیں زمیں نے موسم پلٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے ۵ برس گذر گئے۔ اس دوران میں پنڈت گردھاری لال اور
مہاراج رام جیاون بیکنٹھ سدھارے۔ راما اب ایک وجیہ تحیم شحیم جوان تھا۔ اُس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اُس نے اپنی
زمینداری کا کام سنبھالا۔ لین دین بہی کھاتہ اُس کے ہاتھ میں آیا تو اس کے مزاج میں رعونت پیدا ہو گئی۔ سب نشوں سے زیادہ
تیز۔ زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے راما اسی نشہ میں بیخود ہو گیا۔ وہ اپنے کاروبار میں اتنا منہمک ہوا کہ وہ لڑکپن کی محبت کو پریما کے پریم
کو۔ رام جیاون مہاراج کی وفاداری کو بالکل بھول گیا۔ اس نے ایک دن بھی بھولے سے خبر نہ لی کہ یتیم پریما اور دکھیا درگا کی کیسی
گذر رہی ہے۔
رام جیاون مہاراج کے کوئی جائداد تو تھی نہیں جس سے درگا کی جیون سے بسر ہوتی مہاراج کے مرنے پر جو دس بیس روپئے
گھر میں تھے بھی تو وہ انھیں کی کریا کرم میں ختم ہو گئے۔ صرف ایک گائے گھر میں تھی ماں بیٹی کی زندگی کا اب ایک ہی سہارا تھا اُس کا

دودھ اور گھی بیچ کر ان کی بسر اوقات ہوتی کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑ جاتے۔ اسی حالت میں ایک دن درگا نے پریا سے کہا "جی میں آتا ہے کہ اپنی مصیبت کا حال راما بابو سے جا کر کہوں۔ کیا وہ ایسی حالت میں ہماری مدد نہ کریں گے۔

پریا نے اداس ہو کر جواب دیا "نہیں نہیں اماں ان کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ ——— "کیوں؟"۔

——— جب ان کو خود خیال نہیں ہے تو ہمارے کہنے سے ان پر کیا اثر ہوگا"

"ایک دن کہکر تو دیکھوں مجھے تو پوری اُمید ہے کہ وہ ہماری غریبی پر رحم کریں گے۔ کیا تیرے باپ کا بھی ان کو کچھ خیال نہ ہوگا مہاراج کا ذکر کرتے ہی دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں خوب جی بھر کر روئیں جب کچھ جی ہلکا ہوا تو درگا نے کہا بیٹی تو سچ کہتی ہے میں کسی کے پاس نہ جاؤنگی۔ جب ان کے جیتے جی میں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تو اب اُن کے مرنے پر بھیک مانگ کر ان کی آتما کو دکھ نہ پہنچاؤنگی"۔ اس کے بعد پھر دونوں میں اس قسم کی باتیں کبھی نہ ہوئیں ایک مرتبہ راما کی ماں تلسی نے درگا کو اناج بھیجا بھی لیکن اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔

سال بھر تک جس طرح سے بھی ہوسکا درگا نے دن کاٹے پھٹے کپڑوں کو سی کر کسی طرح کام چلایا۔ لیکن برسات میں ایک نئی مصیبت آئی۔ اس کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ برسات میں کئی دن تک موسلا دھار پانی برسا تو اس کے مکان کا ایک حصہ گر پڑا گائے وہاں بندھی ہوئی تھی دب کر مر گئی۔ اس نئی مصیبت نے ان کی پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ گھر میں دو چار چاندی کے زیور بھی تھے وہ بک گئے پریا نے راما کی دی ہوئی۔ چوڑیاں ایک کپڑے میں باندھ کر پٹاری میں رکھدی۔ راما کی یہی ایک یادگار تھی پریا نے سوچا کہ اگر وہ ان کو پہنے رہیگی تو ٹوٹ جائیں گی۔ فکر معاش بڑی بری بلا ہے درگا اب کھیتوں اور چراگاہوں سے گوبر اٹھا لاتی پریا اپلے تھاپتی اور درگا گاؤں میں پھر کر بیچ لاتی۔ کبھی گوبر نہ ملتا تو اور بھی مصیبت ہوتی کبھی کوئی اپلے چرا لیجاتا تو فاقے کرنے پڑتے دنیا کا بھی عجیب حال ہے کوئی ہنس رہا ہے اور کوئی رو رہا ہے۔ کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں۔ کوئی رو رو کر زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

راما کی بیسویں سالگرہ کا دن تھا دروازہ پر مردوں کا اور گھر میں عورتوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف گھی کی اور دوسری طرف تیل کی پوریاں پک رہی تھیں۔ گھی کی معزز موٹے برہمنوں کے لئے تیل کی فاقہ کش نیچوں کے لئے۔ راما کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ عورتیں سیانے گیت گا رہی تھیں بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے پھرتے تھے مالن پھولوں کا گجرا کیلے کی شاخیں لائی کمہار نئے چراغ اور ہانڈیاں دے گئے "بناری" سرسبز ڈھاک کے پتل اور دونے دے گیا۔ کہار نے آکر کلسہ میں پانی بھرا۔ بڑھئی نے راما کے لئے نئی پیڑھی بنائی۔ نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی۔ راما جب نہا دھو کر اچھے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ایک پنڈت جی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کرتے براجمان ہوئے۔ راما کو پیڑھی پر کھڑا کر کے اشلوک پڑھا ایک کچا دھاگا

سر سے پاؤں تک ناپ کر بیسویں گرہ لگائی تل ملا ہوا کچا دودھ پلایا ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں پھولوں کا ہار ڈالکر آشیرباد دی پنڈت پنڈت جی بھلا چوک سے خالی ہاتھ کیسے اُٹھتے ان کا پیٹ بہت بڑا اور خوب پھولا ہوا تھا تلسی نے بھی اس موقع پر پنڈت جی کو خوب "دکھشنا" دی اور پنڈت جی ہنسی خوشی گھر سے رخصت ہوے اُن کے بعد نائی ۔ دھوبی ۔ بھاٹ ۔ کمہار ۔ لہار ۔ مالی وغیرہ کی باری آئی اور اُن کو بھی انعام سے خوش کردیا گیا ۔ غرضکہ اس دن نور پور میں سوائے درگا اور پر یما کے کوئی اور راما کی چشم عنایت سے محروم نہ رہا ۔ ادھر تو جشن کا یہ ساماں تھا اور ادھر غریب درگا کے یہاں فاقہ تھا ۔ کیونکہ ثروت کے نشہ میں جوزمیندار اپنے اس غریب اسامی کو نیوتہ دینا بھول گیا تھا ۔ شام کو جب سب لوگ کھاپی کر چلے گئے تو اُس کو اتفاقاً پریما کی یاد آئی اور اس نے اپنی ماں سے جاکر پوچھا

"ماں جی! کیا رام جیا دن مہاراج کے یہاں سے کوئی نہیں آیا تھا؟"

تلسی "نہیں تو" :۔ ——— "کیا تم نے اُن کو نیوتہ نہیں دیا تھا"

راما "کیا وہ بغیر نیوتہ کے نہیں آسکتی تھیں وہ ہمارے اسامی ہیں"۔

تلسی "اسامی ہونے سے کیا ہوتا ہے ۔ مہاراج کے گھر کی اکڑ تو سارے گاؤں میں مشہور ہے ابھی تھوڑے دن ہوے میں نے دو من اناج بھیجا تھا لیکن درگا نے واپس کر دیا ۔ وہ عورت اپنے کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے جب تک مہاراج زندہ رہے اس کا آنا جانا بھی رہا اُن کے مرتے ہی اُس نے میرے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا ۔ بھلا بغیر نیوتہ کے وہ ہمارے یہاں کیوں آنے لگی"۔

راما چپ چاپ اپنی ماں کی باتیں سنتا رہا اس کے بعد بولا ۔ خیر درگا نہیں آئی تو اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا مجھے ایک تھالی میں کچھ سیدھا دیدو میں اُس کو جاکر دے آؤں ۔

تلسی "جب تمھاری یہی مرضی ہے تو میں کل سیدھا کسی کے ہاتھ بھجوا دونگی ۔ تمھارے جانے کی وہاں کیا ضرورت ہے لوگ سنینگے تو کیا کہیں گے ۔ تم خود سیدھا لے کر جاؤگے تو درگا کے اور مزاج بڑھ جائیں گے "۔

لیکن راما نے ماں کا کہنا نہ مانا اسوقت اس کے سامنے اس کا گذرا ہوا زمانہ تھا ۔ پریما کی بچپن کی بے لوث محبت اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی ۔ اُس نے تلسی سے سیدھا کی تھالی منگوائی اور اسی وقت درگا کے دروازہ پر پہونچکر آواز دی درگا نے دروازہ کھولکر کہا ۔ "کون" ؟ "راما نے جواب دیا میں ہوں راما"۔

"ہمارے دھن بھاگ ۔ آئے اندر آئے کہئے آج اس طرف مالک کیسے بھول کر آگئے" راما کے دل میں چوٹ سی لگی اُس نے شرمندہ ہوکر کہا ۔ "ایشور جانتا ہے کہ میں گھر کے کاروبار میں ایسا پھنسا رہتا ہوں کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی"۔

اس کا کچھ جواب نہ دے کر درگا نے پریما کو آواز دی "بیٹی ذرا دیا جلادے مالک اندھیرے میں کھڑے ہیں"۔

پریما ایک طرف کونے میں میلی کچیلی دھوتی اوڑھے پڑی تھی ۔ آج اُس کی طبیعت کچھ خراب تھی ۔ ماں کی آواز سنکر وہ اُٹھی اور

آہستہ سے کہا" ماں جی دیا میں تیل نہیں ہے" اس کی آواز میں حسرت بھری تھی۔ گو پریا کو راما نے نہ دیکھا لیکن اس کی آواز سن لی اور کہا "دیا جلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اب جا رہا ہوں ماں جی نے تمھارے لئے اس تھالی میں کچھ بھیجا ہے اسکو لے لو" یہ کہکر راما نے تھالی بڑھائی۔ لیکن درگا پیچھے ہٹ گئی اُس نے اپنے کو سنبھال کر کہا "مالک ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں"۔ یہ سوکھا جواب سُن کر راما سناٹے میں آگیا غریبوں میں بھی خودداری کا مادہ ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا۔ ایک غریب برہمنی نے اس کو ذلیل کیا اُس کا اُسے سخت صدمہ ہوا اور وہ سیدھا کی تھالی لیکر درگا کے گھر سے نکل کر اپنے گھر واپس آگیا۔

راما کے جانے کے بعد پریا نے اپنی ماں سے کہا "معلوم ہوتا ہے بابو جی ناراض ہو گئے ہیں"

درگا نے جواب دیا "بھگوان راضی رہیں کسی کی ناراضگی کی کچھ پروا نہیں ہے۔

پریا اب انیسویں سال میں تھی اس کی جوانی کا چاند بڑی آب وتاب سے چمک رہا تھا حسن و رعنائی کی تمام خوبیاں قدرت نے فیاضی سے پریا کو عطا کی تھیں اس کے انداز میں بھولا پن۔ باتوں میں نغمہ کی دلفریبی۔ آنکھوں میں حیا اور خیالات میں پاکیزگی تھی لیکن ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ غریب کی جوانی جاڑوں کی چاندنی تھی کوئی قدردان نہ تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی۔ دان دہیز دینے کے لئے درگا کے پاس کچھ نہ تھا جوان جہان لڑکی کو دیکھ دیکھ کر اس کے گلے سے پانی نہ اترتا تھا۔ دو چار جگہ اُس نے نسبت کا پیام بھی دیا لیکن کوئی دوسو سے کم دان لینے پر راضی نہ ہوا۔ دوسو روپے تو بہت ہوتے ہیں اُسکے گھر میں اتنے ٹھیکرے بھی نہ رہے ہوں گے۔ درگا گاؤں میں جس طرف سے نکلتی لوگ اُس کو سنا سنا کر کہتے جوان لڑکی گھر میں بٹھا رکھی ہے بیاہ نہیں کرتی نہ جانے اس کا کیا ارادہ ہے"۔ درگا لوگوں کے طعنے سنکر شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتی اس لئے گاؤں میں اُپلے بیچنا بند کر دے ایک دوسرے گاؤں میں اُپلے جاکر بیچنے لگی وہاں بھی کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے درگا کو دق کرنا شروع کر دیا۔ بیچاری کی جان بڑی مصیبت میں تھی کبھی سوچتی کہ گنگا جی میں ڈوب کر اپنی جان دیدے لیکن جب پریا کا خیال آتا تو اپنے ارادہ سے باز آجاتی۔ اب درگا دن رات اسی فکر میں رنجیدہ رہنے لگی لبسا اوقات وہ پریا پر بھی خواہ مخواہ خفا ہو جاتی ذرا سی بات پر اسکو جھڑک دیتی اس پر اگر پریا رونے لگتی تو خود بھی اس کے ساتھ روتی ایک دوسرے کے دل کا حال جانتی تھی لیکن زبان پر نہ لاسکتی تھی۔ اسی طرح دن گذر رہے تھے۔ ایک دن درگا کی ایک سہیلی گورا اُس سے ملنے آئی تو اُس نے کہا "جیجی! پریا کا بیاہ کب کروگی لڑکی بہت سیانی ہو گئی ہے اُس کو کواری بیٹھا رکھنا بڑے شرم کی بات ہے گاؤں بھر میں تمھاری بڑی بدنامی ہو رہی ہے"۔ درگا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "بہن کیا بتاؤں بہت تلاش کرنے پر بھی ابھی تک کوئی بر ہی نہیں ملا"۔

گورا۔ "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن خاموش رہنے سے تو کام نہیں چلے گا میرے خیال میں تو تم کو اب دیر ہی نہیں کرنی چاہیئے"۔

درگا۔ "بہن تمھیں پریا کو کہیں ٹھکانے سے لگا دو بڑی کرپا ہو گی۔

گورا نے کہا اچھا میں دیکھوں گی۔ یہ کہکر گورا چلی گئی۔ دو چار دن کے بعد وہ پھر آئی اور اُس نے آتے ہی درگا سے کہا "جیجی مٹھائی کھلاؤ میں نے پریا کے لئے بَر ڈھونڈھ لیا ہے"۔

درگا نے خوش ہو کر کہا "کہاں؟"۔

گورا "مہاراج بنسی دھر کو تو جانتی ہی ہو"۔

درگا۔ "وہی نا جو امرجیہ میں رہتے ہیں"۔

گورا "ہاں وہی وہی"۔

درگا "اُن کی عمر تو بہت زیادہ ہے۔ وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں"۔

گورا "عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے وہ مرد ہیں ان کی عمر کون خیال کرتا ہے۔ ان کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت لوگ بیاہ کرتے ہیں اور جیجی بُرا نہ مانو تو کہوں کہ تمھاری لڑکی بھی تو بہت سیانی ہے۔ بَر بالکل چھوکرا ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا مانوں تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو بڑے امیر ہیں بیس پچیس بیگھے مورثی کا شتکاری ہے۔ تالاب۔ باغ۔ سب ہی کچھ تو ہے اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ دان دہیز بھی نہ لیں گے۔ کہو منظور ہے کہ نہیں؟"۔

درگا بنسی دھر کے ساتھ پریا کا بیاہ کرنے کے لئے کبھی نہ راضی ہوتی لیکن جب اُس نے سُنا کہ کچھ دان دہیز بھی نہ دینا پڑے گا تو وہ مجبوراً راضی ہو گئی۔

گورا نے کہا "ایک بات اور ہے وہ یہ کہ کل کچھ عورتیں مہاراج بنسی دھر کے یہاں سے پریا کو دیکھنے آئیں گی"۔

درگا "بہن ایسا تو میرے یہاں کبھی نہیں ہوا۔ میرا میکہ کھا گا میں ہر دہاں جب تک بیاہ نہیں ہو لیتا سسرال والے لڑکی کو دیکھ نہیں سکتے"

گورا "خیر تم ایک کام کرو کل سویرے پریا کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا دینا امرجیہ سے جب عورتیں میرے یہاں آئینگی میں کسی بہانے سے پریا کو اپنے گھر بلا لیجاؤنگی اس طرح سے پریا کو وہ دیکھ لیں گی اس میں کوئی حرج نہ ہوگا"۔

درگا نے خوش ہو کر کہا "ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے"۔

"اچھا تو میں اب جاتی ہوں" یہ کہکر گورا اپنے گھر چلی گئی۔ درگا آج بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی پٹاری کھول کر ایک پھٹی پُرانی دھوتی اور شلوکہ نکال کر دھو دیا اور اُس کی مرمت کر دی۔ صبح کو گورا سے یہ سب باتیں ہوئیں اور شام تک گاؤں بھر میں اُس کی خبر ہو گئی جس کسی نے بھی سُنا کہ درگا اپنی بھول سی لڑکی کا بیاہ بوڑھے کھوسٹ بنسی دھر سے کرنے والی ہے اسی نے افسوس کیا لیکن درگا نے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پروا نہ کی اُسکو اس کے سوا کچھ خیال ہی نہ تھا کہ جس طرح بھی ہو پریا کا بیاہ ہو جائے اور دان دہیز نہ دینا پڑے بدنامی ہوگی تو کیا اپنے فرض سے سبکدوش تو ہو جائے گی۔ پریا سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہی سب کچھ جان بوجھ کر بھی وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ وہ دوسرا کا بہانہ

کرکے سرشام ہی سے لیٹ رہی اور چپکے چپکے ساری رات آنسو بہاتی رہی۔

صبح کاذب کا وقت تھا۔ چاند دھندلی دھندلی روشنی ڈال رہا تھا کہ درگا نے پریا کو بلاکر کہا "بٹیا جلدی سے اُٹھ گنگا مائی میں اشنان کرآ۔ یہ لے شلوکہ اور دھوتی اسکو نہا کر پہن لینا۔ ہاں خوب یاد آیا ذرا ٹھہر جا" یہ کہتی ہوئی درگا نے اپنی پٹاری کو کھولا اور اُس میں سے راما کی دی ہوئی کانچ کی چوڑیاں نکالیں اور بولی "تیرے بدن پر کوئی زیور نہیں ہے میں اب تجھے بنوا دونگی آج تو یہ چوڑیاں پہن لے یہ بھی بہت خوبصورت اور قیمتی ہیں" پریا جو اب تک خاموش سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی چوڑیوں کو دیکھکر یکبارگی چلا اٹھی "نہیں ماں نہیں میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں میں ان چوڑیوں کو نہیں پہنوں گی" درگا نے ڈانٹ کر کہا "پہنے گی کیسے نہیں۔ بس یہی تو تجھ میں ایک بڑا عیب ہے۔ کہنا نہیں مانتی" یہ کہکر درگا نے زبردستی چوڑیاں پہنا دیں اور پریا کو نہانے کے لئے بھیج کر آپ کسی دوسرے کام میں لگ گئی۔ آج ہی امرجیہ سے عورتیں پریا کو دیکھنے آئیں گی درگا کو جلدی تھی کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو پریا نہا دھوکر فارغ ہو جائے۔ پریا جب گھر سے نکلی اسوقت بھی اندھیرا تھا وہ آہستہ آہستہ کچھ سوچتی ہوئی دریا کے کنارے پہنچی۔ ستاروں کی مدہم روشنی کے عکس سے دریا کا بعض بعض حصہ سانپ کی کینچل کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ تمام دنیا سنسان تھی دریا کے کنارے پریا نے دھوتی شلوکہ ایک طرف پھینک دیا گنگا مائی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولی "ماتا! میں نے کون پاپ کیا ہے جو سب کی آنکھوں کا کانٹا بن رہی ہوں۔ کیا میرے لئے دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے جو میری ماں مجھے آگ میں جھونکنے کے لئے تیار ہو گئی ہے۔ ماتا! میرے دل میں جس کی محبت بچپن سے تھی جب وہی میرا نہ ہوا تو اب دنیا میں مجھے کسی سے کچھ امید نہیں ہے۔ ماتا کیا تم بتا سکتی ہو کہ راما نے مجھے کیوں بھلا دیا۔ ماتا تم جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ اچھا میں سمجھ گئی۔ تم کہتی ہو کہ اُن کا نام جپو۔ لیکن میں تو انکا نام آج سے نہیں بالے پن سے جپتی ہوں پھر بھی وہ میرے نہیں ہوئے۔ ماں میں دہرتی ماتا کی پیٹھ کا بوجھ ہو رہی ہوں تم اس دکھیا کو اپنی گود میں چھپا لو میں تمھارے سرن میں آئی ہوں۔" پریا کی فریاد سنکر چاند کی تھرکتی ہوئی کرنیں بالو پر لوٹنے لگیں اور گنگا مائی کی لہریں اپنا سر پٹکنے لگیں۔ پریا آگے بڑھی پھر کچھ سوچ کر رُکی اور اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں اتار ڈالیں اور یہ کہکر کہ "میں تو پریم کی چوڑیاں پہنے ہوئے ہوں ان کانچ کی چوڑیوں کی ضرورت نہیں ہے" ان کو توڑ کر ایک طرف زمین پر پھینک دیا۔ جن چوڑیوں کو وہ کبھی اپنے جان و دل سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی تھی انھیں چوڑیوں کو آج اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا اور پانی میں ایک قدم بڑھایا ٹھیک اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی۔

"پریا! پریا! ٹھہرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی مجھ سے بھول ہوئی تم مجھے معاف کردو۔ تم میری غلطی کی سزا جو جی چاہے دیسکتی ہو لیکن تم جو کچھ کرنے جا رہی ہو یہ سزا میرے لئے ناقابل برداشت ہوگی۔ پریا! زور اور طاقت سے کانچ کی چوڑیاں توڑی جا سکتی ہیں لیکن پریم کا بندھن پریم کی چوڑیوں کا تعلق کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اس کے توڑنے کی طاقت نہ تم میں ہے اور نہ مجھ میں ہے۔ پریا! جو میں نہیں کر سکا اس کو تم بھی نہیں کر سکیں۔" یہ راما کی آواز تھی وہ اتفاقاً اسوقت گنگا اشنان کرنے کے لئے وہاں پہنچ گیا تھا

اُس نے پریما کی فریاد سنی - پریما کا خوبصورت مگر اداس چہرہ دیکھا - پریما کو چوڑیاں توڑتے اور ان کو پھینکتے دیکھتا تو اس نے آگے بڑھکر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کو اٹھا لیا - ثابت رہنے پر بھی جن کی اُس نے کبھی کچھ قدر نہ کی تھی وہی معمولی کانچ کی چوڑیاں آج ٹکڑے ٹکڑے ہوکر اُس کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر گئیں - دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ محبت نے ایک کروٹ لی بچپن کی محبت نے زور مارا اور قبل اسکے کہ پریما اپنی چاند سی صورت کو گنگا مائی کی لہروں میں چھپالے راما نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھکر پریما کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پانی سے باہر نکال لیا - جسطرح ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک ایک پتہ کانپنے لگتا ہے اسی طرح راما نے جب پریما کی بانہہ پکڑی تو جوش محبت سے پریما کا ایک ایک عضو کانپ اُٹھا اور وہ راما کے چرنوں میں جھک گئی - محبت کے آنسو دونوں کے آنکھوں سے بہہ نکلے - اسوقت باد سحر مستی سے جھومنے لگی، رات کے جھلملاتے تارے غائب ہوگئے اور صبح ہوگئی - رنج و غم کا کہیں نشان بھی نہ رہا -

کچھ دنوں کے بعد اچھی ساعت میں راما نے پریما کے ساتھ بڑی دہوم دہام کے ساتھ بیاہ کیا - درگا اس مبارک شادی کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہی لیکن اس وضعدار اور آن پر مرنے والی عورت نے اپنی جھونپڑی چھوڑ کر داماد کے یہاں رہنا کبھی گوارا نہ کیا -

اعظم کریوی (سابق مدیر اکبر)

اگرچہ دونوں نئے نئے عنوان سے بیان ہوئے ہیں مگر اصل خیال یہ ہے کہ دوسروں کے سامنے ہم تیرا نام نہیں لے سکتے۔ پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ معاصرین کے خیالات بہت سے غالب سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے جس قدر خیالات جمع کرکے لکھے گئے، وہ ایک خردبین نظر کے سامنے کم نہیں ٹھہر سکتے۔ اور میں مضمون کو زیادہ طویل نہیں لکھنا چاہتا اس واسطے یہیں ختم کرتا ہوں۔ اب وہ حصہ باقی رہجاتا ہے جن میں غالب نے باربار اپنے ہی خیالات کا اعادہ کیا ہے۔ مگر وہ دو قسم کے خیالات ہیں، ایک قسم وہ جسمیں انھوں نے اپنے خیالات فارسی کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اور دوسرے وہ جسمیں خود اپنے ہی اُردو کلام سے فائدہ اُٹھایا ہے گر کوئی سوال کرے کہ وہ کس قدر ہیں تو میں کوئی صحیح جواب دینے سے مجبور ہوجاؤں گا۔ میں چاہتا تھا کہ فارسی کے ترجموں کو بالکل چھوڑ دوں۔ مگر اس خیال میں کچھ استقلال پیدا نہیں ہوا۔ لہذا پانچ چھ شعر نمونہ کے لئے لکھے دیتا ہوں:۔

غالب:۔ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

خود را بہ نقش طرازی علم کنم تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

غالب:۔ ہم ہیں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب رسم اُمید ہمانا ز جہاں برخیزد

غالب:۔ مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

غالب:۔ ازمکر تمش ناف زمیں ناف غزال ست
مشکیں زچہ شد ورنہ لباس حرم آیا

غالب:۔ ہے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدہ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

خستۂ عجزیم و از ما جز گنہ مقبول نیست تکیہ دارد بر شکست توبہ استغفار ما

غالب:۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت میتواں گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

غالب:۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش آنروز کہ وقت باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم باحسرت عیشہائے ناکردہ خویش

یہ خیال کچھ مرزا غالب کے اس قدر دلنشین ہوگیا تھا۔ کہ انھوں نے باربار اس کا اعادہ کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی ابر گہر بار میں بھی اسکا اعادہ کیا ہے۔

میں اسیقدر لکھکر مضمون کو ختم کرتا ہوں چونکہ اردو کے تکرار خیالات کے لئے مستقل مضمون چاہئے لہذا اسپر کسی دوسرے وقت روشنی ڈالونگا بہت ممکن ہے کہ بعض حضرات اشعار مذکورہ میں الفاظ سے دہوکہ کھاکر شرحیں پیش کریں۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا ہوسکتا ہی مگر میں نے جس خیال کی بنا پر دو خیالوں کو یکساں ٹھہرایا ہے اُسکو دفع کرنے کی بھی کوشش کریں۔ ورنہ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ ہر شعر کے لفظ جدا ہیں۔ بہرحال یہ ایک سعی ہی جو پیش کیجاتی ہی۔ اور وہ بھی محض ایک دوست کے اس اصرار پر کہ غالب کا ہر خیال نیا ہی اور اُس کے خیال بلند کی جگہ پر کسی دماغ کی رسائی نہیں۔ شاید اب اُن کی سمجھ میں آجائے میرے عزیز دوست کو یاد رکھنا چاہئے کہ فن شاعری ایک ایسا فن ہی کہ اس میں کوئی بڑے سے بڑا شخص اپنے ذاتی اچھوتے خیالات پیش نہیں کرسکتا چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہی بقول شخصے ؎ یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آن ہر کجا مے نگرم انجمنے ساختہ اند۔

"آرگس"

چنگاری

(فسانہ)

اس میں شک نہیں کہ یوسف سخت مادہ پرست، بے انتہا سطحیات پسند اور ضرورت سے زیادہ جامد انسان تھا۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ قوت تنقید اسکی نہایت زبردست تھی۔ اور اگر وہ دنیا اور اس کے کاروبار کو ہمیشہ صرف ڈُوا اور ڈُود کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھتا بلکہ کبھی کبھی وہ سطح سے گزر کر عمق تک بھی پہونچ جایا کرتا تو اس میں کلام نہیں کہ وہ نہایت اچھا نقاد ثابت ہوتا۔ شعر و شاعری سے اسے مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن جب وہ اپنے اصول کے لحاظ سے اس پر اظہار رائے کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ شاید وہ ایک حد تک صحیح کہہ رہا ہے۔

ایک دن آئینہ سامنے لئے بیٹھا تھا کہ دفعتہً کھڑا ہو گیا اور بولا کہ یوں تو میرے والدین کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں، لیکن ایک ظلم انھوں نے اتنا بڑا مجھ پر کیا ہے کہ میں شاید عمر بھر اُسے معاف نہیں کر سکتا۔ فرض کیجئے کہ آپ کو کسی چیز سے نفرت ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے آپ پر لازم کر دی جائے تو آپ کو دیوانہ ہو جانا چاہئے یا نہیں۔ ذرا میری صورت کو ملاحظہ کیجئے اور اسی کے ساتھ میرے نام (یوسف) پر غور کیجئے کیا اس سے زیادہ ملعون مثال مبالغہ کی اور کوئی ہو سکتی ہے۔

جس وقت کوئی میرا نام لیکر پکارتا ہے تو فوراً والدین کی یہ شاعری میرے سامنے آجاتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ کوئی نہایت مکروہ چیز میرے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے اور ہر شخص میرا نام لیکر گویا مجھے بدصورتی کا طعن دیا کرتا ہے"

وہ اپنے اطوار کے لحاظ سے نہایت سادہ انسان تھا اور چاہتا تھا کہ ہر چیز کو اسی سادگی سے دیکھے جیسی وہ نظر آتی ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ سطح سے گزر کر عمق کی طرف بڑھنا فطرت کی توہین ہے کیونکہ جس حقیقت کو اُس نے ہم سے چھپایا ہے اس کا احترام ہم پر واجب ہے، اور اُس کو بے نقاب کرنا اپنے حدود سے بڑھ جانا ہے۔ وہ کہا کرتا کہ اگر آسمان نیلا نظر آتا ہے، تو اسے نیلا ہی کہو، اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ حقیقتاً نگاہ کا دھوکا ہے، نظر کا فریب ہے۔ علی الخصوص اُس وقت جب کہ ہماری کوئی غرض اُس سے وابستہ نہیں، تحقیق و تفتیش کے مفاد و نتائج کا وہ قایل ضرور تھا، لیکن اسی حد تک کہ خود اپنے استنباط و استقراء سے وہ کسی نتیجہ تک پہونچے، دوسرے کی مسلمات پر وہ خود اپنا کوئی نظریہ قائم نہیں کرتا تھا۔ وہ اُس کو ایسا ہی ناجائز سمجھتا تھا جیسے کسی اور کی ڈالی ہوئی بنیاد پر کوئی شخص اپنی عمارت طیار کرے حالانکہ اسے بالکل علم حاصل نہیں ہے کہ یہ بنیاد کس حد تک مستحکم ہے اور کس نوع کی عمارت کی متحمل ہو سکتی ہے۔

اس کا خیال تھا کہ دنیا میں ہر شخص ایک جداگانہ کام کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ وضعی اختلاف کسی تدبیر سے دور نہیں ہو سکتا اور نہ ایک انسان کو اپنے ان حدود سے متجاوز ہونا چاہئے جو فطرت کی طرف سے مقرر ہیں۔ اسی لئے وہ سب سے زیادہ جن جماعتوں سے متنفر تھا ان میں

پہلا درجہ اُس نے حکما، وفیلسوف کا رکھا تھا اور دوسرا شعرا کا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر دنیا ان دونوں جماعتوں سے خالی ہوجائے تو پھر نہ کوئی فساد پیدا ہوسکتا ہے اور نہ عالم میں مکروفریب کی اشاعت ہوسکتی ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی امن وسکون نام تھا صرف دماغ کی سادگی کا اور اخلاق کی بلندی صرف راست گوئی کا اور زبان کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ ذہن کے سادہ اور اکات کو چند ضروری الفاظ سے بغیر کسی فضول اضافہ کے ظاہر کردے۔ شعرا میں صرف میر ہی ایک ایسا خوش نصیب شاعر تھا جس کے ذکر کو وہ سن لیتا تھا اور غالب کا نام لینا تو اس کے سامنے کفر تھا۔ وہ کہا کرتا کہ "سرپنجۂ مژگان آہو" کی حقیقت پر غور کرنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی بھینس کے لئے خود اپنے ہاتھ سے بھوسہ طیار کرنے میں وقت صرف کروں، یہاں تک خیر کوئی مضایقہ نہیں کہ

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا تھا

ایسا ہوتا ہے، ہوسکتا ہے اور محبت کی اس کیفیت کو نہایت سادہ اور بالکل ضروری الفاظ سے ظاہر کردیا ہے، لیکن ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل کے کیا معنے؟ اگر صرف سیر گل کافی ثبوت بے مہری کا ہوسکتا ہے تو دنیا کا ہر شخص بے مہر قاتل ہے اور اگر ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قاتل کی سیر گل صرف بے مہری کی بنا پر ہے تو اس کا ثبوت کیا۔ الغرض وہ شاعرانہ مفروضات کا سخت دشمن تھا اور خصوصیت کے ساتھ وہ شاعری جس میں صرف واویلا اور گریہ وزاری ہوتی، اسے نہایت مکروہ سمجھتا، کیونکہ وہ ایسی شاعری کو قوائے عمل کا دشمن سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ کی صحبت کا لطف میں کبھی نہ بھولونگا۔ یوسف اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا چند ضروری خطوط دیکھ رہا تھا کہ ایک شاعر جو یوسف سے بھی بے تکلف تھے مجھ سے ملنے کے لئے وہاں آگئے۔ دوران گفتگو میں انھوں نے اپنا ایک شعر سنایا جس میں "خونِ دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو" ذرا مختلف انداز سے بیان کیا گیا تھا۔ یہ شعر سنتے ہی یوسف نے خطوں کو علیحدہ رکھ کر شاعر صاحب کی صورت کو غور سے دیکھا اور بولا کہ "معاف فرمائیے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ غذا کس ملک کے انسانوں کی ہے اور کیا ایک درندہ کی طرح خون پینے والا اور کچا جگر چبانے والا آدمی دعوائے محبت بھی کرسکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے محبوب نے آپ کا یہ شعر سنا ہے یا نہیں، لیکن اگر اب تک وہاں نہیں پہونچا ہے تو مہربانی فرماکر اُسے اپنی طرف منسوب نہ کیجئے ورنہ ممکن ہے آپ کو کسی حدیقۂ حیوانات میں پہونچا دے۔ اور اگر اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ کی غذا بالکل ترک ہوگئی ہے تو بھی اس کا کیونکر کسی کو یقین آسکتا ہے جبکہ پورے ساڑھے سولہ انچہ کا کالر آپ کی گردن کے لئے اب بھی درکار ہوتا ہے۔

تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک جامع شخص تھا اور تمام فنون متداولہ میں فاضلانہ آگاہی رکھتا تھا، چونکہ اس کے والد خود عربی فارسی کے عالم تھے اس لئے انھوں نے سب سے پہلے یوسف کو وہی پڑھایا جو خود انھوں نے پڑھا تھا اور پھر اس کے بعد انگریزی شروع کرائی جس وقت [illegible] فلسفہ کا بی اے ہوکر کالج سے نکلا تو لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ اس جیسے سطح بیں انسان نے کیسے فلسفہ کی گہرائیوں

سے دلچسپی پیدا کی، اور کیوں اس نے اس موضوع کو اپنے لئے انتخاب کیا، بعض نے جب اس سے اس کا سبب دریافت کیا، تو اُس نے جواب دیا کہ دنیا کے پاس سب سے بڑا ذریعہ حقیقتوں کو پوشیدہ کرنے کا فلسفہ ہے اور میں نے اسی لئے قصد کر کے اس کا مطالعہ کرنا چاہا تھا کہ اگر کوئی خامی میرے عقاید حیات میں باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی نکل جائے، کیونکہ میرے خلاف جو بڑے سے بڑا حربہ فلسفہ کا استعمال کیا جا سکتا تھا اس کی حقیقت کو بھی میں نے معلوم کر لیا اور آج اپنے آپ کو میں اپنے عقاید دیرینہ پر اور زیادہ راسخ العقید پاتا ہوں"

شادی کی نسبت اس کا خیال تھا کہ اس کا تعلق انسان کی ذات سے نہیں بلکہ ہیئت اجتماعی سے ہے اور اس لئے وہ کہا کرتا تھا کہ بیوی وہی ہے جسے والدین اپنے خاندان کے مصالح کے لحاظ سے منتخب کریں اور چونکہ اس کے والدین مر چکے تھے اور گھر میں اب وہی تنہا رہ گیا تھا اس لئے اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ایک تنہا انسان کو بیوی کی کیا ضرورت ہے۔

جایداد کافی تھی اور کاشت کا شوق اسے فطری تھا۔ اس لئے اس کے شب و روز ایک کسان کی طرح بسر ہوتے تھے اور وہ صرف اس خیال سے مسرور تھا کہ اس کی دولت سے گانوں کے بہت سے مویشی، مزدور اور کاشتکار فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور ان کے درمیان وہ ایسی زندگی بسر کر رہا ہے جس میں دماغ پر کسی قسم کا زور ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جس وقت رات کو وہ الاؤ کے سامنے بیٹھ جاتا اور گانوں کے بہت سے معصوم انسان اس کے چاروں طرف جمع ہو کر نہایت سادہ قسم کی باتیں کیا کرتے تو وہ بہت خوش ہوتا اور سمجھتا کہ دن بھر کی محنت کا ماحصل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایک زمانہ اسی طرح گذر گیا، یہاں تک کہ یوسف نہایت ہی سخت قسم کا دہقانی ہو کر رہ گیا، اور خیالات نے اس کی وضع ظاہری کو بھی بدل دیا بھدا سا دیہاتی جوتا پانوں میں، گاڑھے کا کلیجے دار کرتہ جسم میں اور موٹی مارکین کا صافہ سر پر، مونچھ داڑھی الجھی ہوئی، سر کے بال پریشان یہ تھی حالت یوسف کی جو دولت کے لحاظ سے ایک تعلقہ دار، اور علم کے لحاظ سے ایک فاضل اجل کی حیثیت رکھتا تھا۔

(۲)

مس ہلن عہد مغلیہ کے فنون لطیفہ سے کس حد تک ماہر تھیں اس کا صحیح علم تو شاید کلکتہ یونیورسٹی کے اُنھیں طلبہ کو ہو گا جہاں وہ اس مخصوص موضوع پر لکچر دینے کے لئے فرانس سے بلائی گئی تھیں، لیکن یہ حقیقت اب ہر ذی علم طبقہ پر روشن ہو چکی تھی کہ دماغ انسانی اور فنون لطیفہ کے درمیان خود مس ہلن کا وجود یقیناً ایک نہایت ہی اہم کڑی تھا۔

اُس کی تقریر سے کوئی شخص فنون لطیفہ کی ماہیت سمجھ سکتا یا نہیں، یہ امر تو مشتبہ ہو سکتا تھا، لیکن اس کے خط و خال، اس کی رعنائی شباب، اس کی تکمیل حسن اُس کی خوش ادائیوں کے ساتھ تمام وہ کیفیات جو نفسیاتی اصول کے ماتحت نفسانی لذت و نشاط کا سامان فراہم کر سکتی ہیں، اس درجہ مکمل طور پر اس کے اندر موجود تھیں کہ برسوں کے لکچر ایک طرف اور چند لمحوں کے لئے اس کا سامنے آجانا ایک طرف وہ خود فنون لطیفہ میں سے ایک ایک چیز کی اس قدر تکمیل کے ساتھ حامل تھی کہ مشکل سے کوئی دوسرا پیکر اس قدر جامع نظر آ سکتا ہے

اس کے چہرہ کے خطوط، یہ معلوم ہوتا تھا کہ فطرت ابھی ابھی کسی تازہ نقاشی کی فکر سے فارغ ہوئی ہے اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی ہر جنبش ایک بدیعۂ موسیقی پیدا کرتی محسوس ہوتی تھی۔ یقیناً وہ ایک شعر تھی متحرک، ایک نغمہ تھی ذی حیات، ایک رقص تھی مسلسل، اور ایک بہار تھی بے پایاں گفتگو میں اسکی لبوں کی حرکت گویا نسیم فردوس سے دو ملفوف پنکھڑیوں کا جنبش میں آجانا تھا اور جنبش لب کے ساتھ اس کی آواز گویا موج کوثر و تسنیم کا ابل نکلنا۔

ہر چند مس ہلن کو آئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا، لیکن وہ ایسا پھول نہ تھی جس کی شگفتگی کو کلکتہ یونیورسٹی کی چار دیواری چھپانے میں کامیاب ہو جاتی۔ اس کی نکہت منتشر ہوئی اور اس حد تک ایک عالم اس کا آشفتہ ہو کر رہ گیا۔ مس ہلن کی ایک اور خصوصیت جو اس کے حسن ظاہری اور کمالات علمی سے زیادہ تباہ کن تھی، اس کا ذوق سلیم تھا۔ اس میں صرف فضل و کمال کی سنجیدگی ہی نہ پائی جاتی تھی۔ بلکہ اس کے تصور و خیال میں بھی فطرت نے اس قدر بلند پاکیزگی و دلیعت کر دی تھی کہ مشکل ہی سے وہ کسی وقت اُس سطح پر دیکھی جاتی تھی جہاں پہونچکر ایک عورت اپنے آپ کو لطف کے لئے پیش کر سکتی ہے لیکن کوئی در پرستش پیدا نہیں کر سکتی اس کا قول تھا کہ اگر عورت زمین کی کوئی چیز ہے تو اُس کو کسی نہایت ہی عمیق سمندر کا موتی ہونا چاہئے اور اگر وہ آسمان کی پیداوار ہے تو پھر اس فضائے بسیط کا وہ بعید ترین ستارہ ہونا چاہئے جس کی صرف ہلکی سی جھلملاہٹ کبھی کبھی اہل دنیا کو نظر آئے" وہ کہا کرتی کہ عورت کے لئے پردہ ضروری ہے لیکن چہرہ و جسم کا نہیں کیونکہ یہ خود اس کا ظاہری ملبوس ہے، بلکہ اسکی فطرت کا جو بے نقاب ہونے کے بعد مرد کی سانس سے داغدار ہو کر بہت جلد مرجھا جاتی ہے۔ پھر اس کی یہ باتیں صرف زبانی ادعا نہ تھا بلکہ وہ حقیقتاً اس پر عامل بھی تھی اور یہی خاص سبب تھا کہ اس کی طرف سے لوگوں میں غیر معمولی بے چینیاں پیدا ہو گئی تھیں۔

جس وقت یوسف کو اُس کے دوست پروفیسر حبیب کا خط ملا کہ وہ چند دن کے لئے محض تفریح و سیاحت کے لئے معہ مس ہلن کے اس کے پاس آرہا ہے تو وہ بہت گھبرایا کہ خیر حبیب تک تو کوئی مضایقہ نہ تھا لیکن یہ مس ہلن کیا معنی لیکن چونکہ حبیب اس کا نہایت ہی عزیز دوست تھا اس لئے وہ انکار تو نہ کر سکتا تھا، تاہم اس نے یہ اطلاع دیدی کہ اگر میں تمہارے شریک سفر کے ذوق کے لحاظ سے کوئی انتظام نہ کر سکوں تو مجھے الزام نہ دینا، کیونکہ ایک دہقان سے وہ رکھ رکھاؤ تا ممکن ہے جو ایک مغربی خاتون کے لئے ضروری ہے حبیب نے جواب دیا کہ وہ شہر کو چھوڑ کر گانوں اس لئے نہیں آنا چاہتیں کہ شہر کو اپنے ساتھ لیجائیں بلکہ وہ تو یہاں کی دہقانی ہی زندگی کا تجربہ کرنے آرہی ہیں۔ تاہم یوسف نے گانوں کی پرانی گڑھی جو اس کے خاندان کے قبضہ میں صدیوں سے چلی آرہی تھی اور اب واقع ہونے کے لحاظ سے بہت لطف کی جگہ تھی، صاف کرا کے اُس میں ضروری سامان اُن کے آسائش کا فراہم کر دیا۔

پروفیسر حبیب، یوسف کے ساتھیوں میں تھے اور ان لوگوں میں سے جو یوسف کی سادہ فطرت سے ایک بچہ کی طرح الفت رکھتے تھے۔ حبیب بے انتہا سنجیدہ انسان تھا اور مشکل ہی سے کوئی بات اُس سے تخراج تبسم حاصل کر سکتی تھی، لیکن یوسف کا اُس کے پاس ہونا اُس کے لئے یکسر نشاط

وانبساط ہوا کرتا تھا، اور جب اس کو فلسفہ و تاریخ کے عمیق مطالعہ کے بعد تفریح کی ضرورت ہوتی تو یوسف کے پاس آجاتا اور چھیڑ چھیڑ کر اُسکی باتیں سُنا کرتا۔

پروفیسر حبیب اور مس ہلن کی ملاقات اول اول ٹگور کے شانتی نکیتان میں ہوئی تھی جب ایک مرتبہ سالانہ اجتماع کے موقع پر یہ دونوں بھی وہاں مدعو ہوئے تھے۔ مس ہلن کا ذکر تو حبیب اس سے قبل بھی سن چکا تھا، لیکن، چونکہ وہ خود بڑی حد تک دشوار پسند طبیعت رکھتا تھا اس لئے اس کے اندر کوئی خاص جستجو پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب جو شانتی نکیتان میں اس سے تعارف ہوا تو وہ اس کے سحر جمال سے اس قدر متاثر نہیں ہوا جتنا یہ معلوم کرکے کہ مس ہلن ایک عورت سے زیادہ شاعرہ اور ایک شاعرہ سے زیادہ معبودہ تھی۔ حبیب کے ایک دوست نے جب اُسکی رائے مس ہلن کے متعلق دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ "میں ابھی تک کوئی صحیح رائے مس ہلن کے متعلق قائم نہیں کرسکا کیونکہ وہ ایک ایسی تیتری ہے جو ہنوز ریشم کے خول سے باہر نہیں آئی اور جس کے صحیح خط و خال کی نسبت کوئی پیشین گوئی نہیں کیجا سکتی، لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کی فطرت جس "عورت" کو اس کے اندر طیار کر رہی ہے، وہ ایک ایسا دُرِ خوش آب ہے جس کے لئے فرق شاہانہ کی ضرورت ہے۔"

اُس کے بعد رفتہ رفتہ حبیب کے جذبات نے جو صورت اختیار کی وہ بہت زیادہ سنجیدہ تھی، یعنی یہ بات اب زیادہ شہرت پذیر ہو چلی تھی کہ حبیب مس ہلن کے ساتھ شادی کرنے کے خواہشمند ہیں اور غالباً یہ بھی کہ مس ہلن ان کی اس خواہش کو گوارا کر رہی ہیں۔

(۳)

مہمانوں کو خلد آباد آئے ہوئے دو دن گزر چکے ہیں، شام کا وقت ہے، حبیب مس ہلن اور یوسف باہر کے صحن میں جہاں سے دریا سامنے نظر آتا تھا، بیٹھے ہوئے گفتگو میں مصروف ہیں۔ حبیب پہلے ہی یوسف کی خصوصیات سے مس ہلن کو آگاہ کر چکا تھا لیکن اب تو خود اس نے بھی اس کا کافی مطالعہ کر لیا تھا اور وہ اس کی معصومیت سے خاص دلچسپی لینے لگی تھی، اور جب یوسف موجود ہوتا تو وہ قصداً ایسی گفتگو کرتی کہ یوسف کو زیادہ اختلاف کا موقع ملے۔

افق میں سنہرے بادلوں کے انعکاس سے فضا زرانددہ ہو رہی تھی، دریا کی لہریں ایسی نظر آتی تھیں جیسے پانی میں کسی نے بادلہ اور مقیش کتر کے منتشر کر دئے ہوں۔ موسم پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دفعۃً مس ہلن نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ نے مغرب اور مشرق کی شاعری کا مطالعہ یقیناً کافی کیا ہوگا کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟" یوسف کچھ دیر خاموش رہا اور اس کے بعد بولا "وہی فرق ہے جو مجھ میں آپ میں ہے" مس ہلن مسکرائی اور بولی "یعنی مغرب کی شاعری میں نسائیت زاید ہے، یہ مدعا ہے آپ کا؟"

یوسف "میرا مدعا کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ مختصر سے مختصر فقرہ میں آپ کے سوال کا جواب دیدوں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے شاعری سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں ہے اور اس قسم کے جذبات جن کو نسائیت، موسیقیت، شعریت وغیرہ عجیب وغریب الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے، میری فہم کے حدود سے بالا یا فروتر ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ مغرب کی شاعری میں نسائیت ہے یا نہیں جب کہ شروع سے نسائیت کا مفہوم ہی

ہی میرے ذہن میں نہیں آیا۔

مس ہلن نے اس انداز سے جس طرح وہ کسی بچہ کو درس دے رہی ہو پہلو کی میز سے ایک زریں نقش و نگار کا گلاس اُٹھا لیا اور یوسف کو دکھا کر بولی کہ "آپ اس کے نقوش دیکھتے ہیں اور ان کی بابت کیا رائے ہے"؟

یوسف: "صرف یہ کہ بنانے والے کے پاس وقت ضائع کرنے کے لئے وقت کی کمی نہ تھی، کیونکہ پانی پینے کا مقصود تو ایک سادہ گلاس سے بھی حاصل ہو سکتا ہے اور یہ بھی آپ کی رعایت سے، ورنہ میرے نزدیک تو میرا مٹی کا پیالہ ان سب سے بہتر ہے۔"

مس ہلن اس جواب کو سنکر ہنسی، لیکن اس کی ہنسی میں انبساط سے زیادہ انقباض اور نشاط سے زیادہ ناکامی کی الجھن شامل تھی۔ وہ یہاں صرف تبدیل آب و ہوا کے لئے آئی تھی، لیکن یوسف سے ملنے کے بعد اس نے ایک ایسی عجیب و غریب ہستی اپنے سامنے پائی کہ اس کا غائر مطالعہ کرنے کے لئے وہ مجبور ہو گئی اور جوں جوں اس کا مطالعہ زیادہ وسیع ہوتا گیا، وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ کوئی چیز یوسف میں ایسی موجود ہے جو اس پر غالب ہوتی چلی جا رہی ہے اور یہ یقیناً اس کی زندگی کا سب سے پہلا تجربہ تھا۔ اس وقت تک دنیا والوں نے جس انداز سے اُس کی پزیرائی کی تھی، وہ عجز و فتادگی کے سوا اور کچھ نہ تھا اس لئے اُسکو یقین ہو گیا تھا کہ دنیا کو میرے ہی خیال کا محکوم ہونا چاہیئے، لیکن جب اُس نے یوسف کو دیکھا، جو نہ اُس کے حسن و جمال سے متاثر ہوتا نظر آتا تھا، نہ اس کی پاکیزگی ذوق و خیال سے، تو اس کو ایک قسم کا صدمہ پہونچا۔

عورت اپنے دماغی نشو و نما کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، لیکن جس وقت اس کے پندار کو شکست ہونے لگتی ہے تو وہ اس پست سطح پر آجانے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے جہاں وہ اکثر ناکام ثابت ہوتی ہے اور اس کی ناکامی مرد کی کامیابی ہوا کرتی ہے، لیکن اگر وہ اس طرح کامیاب ہو جائے تو اُس کے بعد اس کی پرواز کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور پھر مرد کے لئے کوئی چارہ کار سوائے اس کے نہیں ہوتا کہ وہ یا تو فرشتہ ہو کر رہجائے، یا شیطان بنکر دنیا میں آفت برپا کردے۔

مس ہلن، جو ضرورت سے زیادہ ذہین تھی اور ہر بات اپنے ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتی تھی جب یوسف کی سطحی باتوں پر غور کرتی تو ان میں بہت زیادہ گہرائی محسوس کرتی اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیوں حبیب نے اس قدر غلط تعارف اس کا کرایا تھا۔ اور جب اس کا یہ خیال زیادہ قوی ہو جاتا تو حبیب کی اس نارسائی ذہن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتی۔ اُسے یوسف کے ساتھ اس وقت تک کوئی لگاؤ پیدا نہ ہوا تھا اور نہ اس کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی، کیونکہ سوائے شباب کے یوسف کے پاس کوئی اور چیز ایسی نہ تھی جسے وہ ہدیۃً کسی عورت کے سامنے پیش کر سکتا، اور مس ہلن اس سے بہت بلند تھی کہ محض کسی کا شباب اُس کو متاثر کر سکے۔ اس لئے زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ اُسے لاگ پیدا ہو گئی تھی اور ایک قسم کا حریفانہ رشک محسوس کرتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ یوسف بھی اسی کے سامنے جھک جائے اُس کی بلندئ ذوق کو حیرت کی نگاہ سے دیکھے، اُس کے خیال سے اپنے زندگی کے ہر لمحہ کو معمور کر دے اور پھر اُس کے بعد وہ ایک پامال و مغلوب شکار کی طرح اس کی درماندگی کے مطالعہ سے لطف اُٹھائے اور چونکہ یوسف کی سنگدلی اس باب میں اس کا بالکل پہلا تلخ تجربہ تھا، اس لئے

ہر ناکامی کے بعد اس کی ضد بڑھتی جاتی تھی اور اس کی ہر ضد بالکل غیر محسوس طور پر اُسے اُس سطح پر آہستہ آہستہ لا رہی تھی جہاں پہونچنے کے بعد ایک عورت کی نازک کلائی خواہ مخواہ کسی مضبوط گرفت کی آرزومند ہو جاتی ہے

وہ یہاں صرف ایک ہفتہ کے لئے آئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ خلد آباد کی صحیح آب وہوا سے اپنے دماغ کو تازہ کرکے پھر کلکتہ واپس چلی جائے گی، لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ یہاں آکر اس کا دماغ اور زیادہ خستہ ہو جائے گا۔ چونکہ اب وہ یوسف کو شکست دینے کے لئے اپنے ترکش کا ایک ایک تیر استعمال کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے بلا لحاظ اس کے کہ مصلحت کا اقتضا کیا ہے، اُس نے تار کے ذریعہ سے ایک ماہ کی اجازت اور حاصل کی اور حبیب کو رخصت کرکے تنہا یہاں رہنے پر آمادہ ہو گئی، بہانہ تو صرف یہ تھا کہ آب وہوا خوشگوار ہے اور وہ ہنوز سیر نہیں ہوئی، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے جلوت کے نشتروں کو ناکام پاکر اب خلوت کے تیروں سے کام لینا چاہتی تھی۔ اس جیسی ذہین عورت کے لئے خوش اسلوبی کے ساتھ حبیب کو رخصت کر دینا اور یوسف سے مزید قیام کی اجازت حاصل کر لینا چنداں دشوار نہ تھا، حبیب چلے گئے اور وہ خلد آباد کی سنسان گڑھی میں ایک خلوت نشین ساحرہ کی طرح اسباب سحر کی طیاری میں مصروف ہو گئی۔

باقی ——— باقی

نیاز فتحپوری

دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(ملاحظہ ہو ''نگار'' ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء)

مسلمانوں کا مسئلہ

اس باب میں میں ہندوستان کا زیادہ روشن پہلو پیش کروں گا جس کا مشاہدہ میں نے گزشتہ موسم سرما میں کیا۔ اس کی زراعتی آبادی کے مادی مصائب کا بیان پوری شرح وبسط سے کیا جاچکا ہے اور یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ اس کی شہری آبادی مفتوح قوم کی حیثیت سے اپنی حالتِ زوال پر کس قدر ماتم کناں ہے اور اب صرف یہ دکھانا باقی رہ گیا ہے کہ وہ کونسی بھلائی ہے جو ان کم ہونے والے مصائب کی کسی حد تک تلافی کر رہی ہے۔ انگریزی حکومت کے طرفدار شیخی بگھارا کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان میں امن و امان پیدا کر دیا ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ امن شریفانہ نعمت ہے۔ لیکن انگریزی حکومت نے اسے اس سے بڑھکر نعمت عطا کی ہے جو شے کہ بلاشبہ تمام ہندوستان کے شکریہ کی مستحق ہے اور جو بجائے خود ایک قیمتی برکت ہے اس لئے کہ اس میں باقی تمام کھوئی ہوئی چیزوں کو دوبارہ فتح کر لینے کی قوت موجود ہے، وہ یہ ہے کہ انگریزی عہد حکومت نے خیالات کی آزادی عطا کی ہے۔ یہ ایک نئی چیز ہے۔ جو ہندوستان کو اس سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی اور ممکن ہے کہ انگریزی اثرات کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی اور یہ ناممکن ہے کہ ایسی چیز کو نعمت سے تعبیر نہ کیا جائے جو فتح کی لعنت کو امید کی برکت میں تبدیل کر دینے کے لئے تقدیر کی گئی ہو +

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو مشرق کو صرف اُس کے دلربا نظاروں کے باعث پسند کرتے ہیں اور میرا جھگڑا یورپ سے اس وجہ سے نہیں ہے کہ اُس نے مشرق میں کیوں تبدیلی پیدا کر دی اس میں کچھ شک نہیں کہ مغربی طریقوں کی حماقت آمیز اور بسا اوقات خود غرضانہ طرز عمل کی وجہ سے ماضی کی بہت سی شریفانہ اور مفید چیزیں تباہ کر دی گئیں ہیں، لیکن میری یہ خواہش نہیں ہے کہ ماضی اپنی مجموعی حیثیت سے واپس آجائے اور نہ مجھے اس کا افسوس ہے کہ وہاں خیالات کے جدید نظام کی تحریک کیوں شروع کی گئی۔ مجھے معلوم ہے کہ وقت پیچھے نہیں لوٹتا اور مجھ سے بڑھکر اور کوئی شخص اس اصول کا قائل نہ ہوگا کہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں جو چیز کہ گزر چکی ہے وہ ہمیشہ کے لئے گزر چکی ہے اور کبھی واپس نہیں آسکتی۔ برخلاف اُس کے مجھے مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات میں دونوں کا فائدہ نظر آتا ہے۔ اور اگرچہ اس کی قدیم خوبصورتی سرعت کے ساتھ تباہ ہو رہی ہے اور اس کی رسوم کا قدیم نظام بدلا جا رہا ہے، تاہم میں غیر محدود توقعات کے ساتھ اس جدید دور کی آمد کا انتظار کر رہا ہوں جس کی تعمیر پرانے کھنڈرات پر کیجائیگی۔ بلاشبہ میری یہ خواہش ہے کہ خاص ملکی چیزوں میں جو کچھ بچایا جاسکے بچا لیا جائے اور اُسے از سر نو تعمیر کے کام میں لایا جائے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ جدید عمارت پرانی عمارت سے بہتر بنائی جاسکتی ہے اور مجھے بے انتہا مسرت ہوگی اگر میں اس کی دوبارہ تعمیر میں کچھ حصہ لے سکونگا

جدید آغاز کی کوئی علامت موجود نہ تھی۔ خیالات ایسے تنگ دائرے میں محدود ہو گئے تھے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا اور قوم کا بیکار دماغ جو اپنی ذہنی جکڑ بندیوں میں مبتلا تھا، نسلاً بعد نسل کمزور ہو رہا تھا۔

ہم اس قسم کے جمود کا انتہائی نتیجہ دوسرے ممالک مثلاً ایشیائے کوچک اور ایران میں دیکھ چکے ہیں اور نیز ان ممالک میں جو ہم سے بہت قریب واقع ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی بالعموم یہی حالت تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اقوام کی نشو و نما میں قدرتاً ایک ایسی منزل آتی ہے جب کہ اُن کی حالت بالکل خراب ہو جاتی ہے اگر یہی جمود عرصۂ دراز تک جاری رہے تو ایسا معلوم ہو گا کہ بابل کی طرح وہ بالکل مر گئی ہیں اور انکی جگہ خالی پڑی رہ گئی ہے یا زیادہ طاقتور اقوام میں وہ جذب ہو گئی ہیں جیسا کہ اس زمانے کے جاندار اور طاقتور ترکوں میں لاطینی جذب ہو گئے تھے۔ تقریباً ہر حالت میں ذہنی بیداری بیرونی اثرات کا نتیجہ رہی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایسی ذہنی بیداری کسی قریب کے ملک میں پائی جاتی ہو جو اپنے ہمسایہ ملک سے زیادہ طاقتور ہو اور اس کا مخالف بھی ہو۔ ایسی حالت میں بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مختلف اقوام کا ایک دوسرے کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالنا باہمی ترقی کا قدرتی اور ضروری قانون رہا ہے۔ مثال کے طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ پر نظر ڈالو تو معلوم ہو جائیگا کہ ان کی جدید ذہنی زندگی کی ابتدا اس حملہ سے ہوئی جو مہذب اور بہادر عربوں نے اسپر اسپین میں سے ہو کر کیا۔ اسی طرح کیتھولک گرجانے اپنے کہنہ اور بوسیدہ نظام کی اصلاح اُسوقت کی جبکہ مغربی ایشیا سے حملے ہونے شروع ہو گئے۔ بعینہ یہی عمل ابن حجم بی

حملہ کی تہ میں کام کر رہا ہے جو گزشتہ سو سال سے یورپ کے وجوہ کو ایشیا کے لئے باعث خطرہ ثابت کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ایشیا اب مغرب کی فاتح عقل سے واقف ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور اس ذہنی ہتھیار سے فائدہ اُٹھا رہا ہے جو اس کے حریف کی طاقت کا حقیقی راز ہے اور یہ کشمکش سب سے زیادہ ہندوستان میں واقع ہو رہی ہے۔ اپنے طویل خواب غفلت کے بعد ہندوستانی دماغ ہر جگہ بیدار ہو رہا ہے اور ہر روز ان مسائل میں سے نئی باتیں پیدا کر رہا ہے جنہیں پہلے وہ ایسی بُری طرح مقید تھا کہ ہر طرف ناامیدی دکھائی دیتی تھی۔

اس بیداری کے لئے ہندوستان بلاشبہ انگلستان کا رہین منت ہے مغرب کے ذہنی طریقوں کا اثر سب سے زیادہ ایشیا کے مذاہب پر پڑا ہے۔ قدیم مذہبی مشاغل جس میں فہم و فراست کو کچھ دخل نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ایسی قلبی واردات کے لئے جگہ خالی کر رہے ہیں جنکی تسکین محض نقلی حوالوں سے نہیں ہو سکتی۔ اور اب یہ حالت ہے کہ تمام مذاہب کے پیرو اُن اُمور پر عقلاً بحث کرتے ہیں جنھیں سو سال پیشتر وہ محض نقلاً بیان کر دینے پر اکتفا کرتے تھے تقریباً اسی قسم کی کیفیت مغربی ایشیا میں ہر جگہ رونما ہو رہی ہے لیکن ہندوستان میں غالباً وہ بہت نمایاں ہے اور یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ خواہ ہمارے عہد حکومت نے دوسرے فوائد کو نقصان پہونچایا ہو تاہم اُس کے مذاہب کو غیر دیدہ و دانستہ اور شاید غیر رضامندانہ طریقہ سے مگر واقعاً اس سے فائدہ پہونچا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ امر غلط معلوم ہوتا ہے تاہم اصلیت یہ ہے کہ اجنبی لوگوں کی دنیوی حکومت نے جنھیں اس بات کا فخر ہے کہ حکومت کا کوئی مقررہ مذہب نہیں ہے مذاہب کی زندگی میں جدید طاقت پیدا کر دی ہے اور انھیں زیادہ

استوار بنیادوں پر قائم کر دیا ہے۔ روحانی عقاید رکھنے والے کو بھی
طاقت پہنچی ہے، وحشی بھی اب ایسے مذہب میں اپنی پرورش پاتا ہے
جو مذہب ہے اور جو اسپر دن بدن زیادہ نیکی کا اثر ڈال رہا ہے +

ہندوستان میں عام طور پر چار بڑے مذاہب پائے جاتے
ہیں۔ ہندو مذہب جو مختلف شکلوں کے ۲/۳ حصۂ آبادی پر مشتمل ہے
اسلام جو پنجاب اور بنگال میں بہت زیادہ طاقتور ہے اور جس کے
نام لینے والوں کی تعداد ۵ کروڑ ہے۔ کیتھولک عیسائی جو زیادہ تر جنوبی
ہند میں پائے جاتے ہیں اور پارسی +

ان میں صرف ہندو مذہب ہی ایسا ہے جو یہاں کا قدیمی مذہب ہے
اور جو کلیتہً دیہاتی آبادی کی فطری رجحانات کے عین مطابق ہے اور
یہ ناممکن ہے کہ کوئی سیاح ان اوہام پرستیوں سے متاثر نہ ہو جنپر وہ
سختی کے ساتھ کاربند ہیں اور جو گویا اس کی بنیاد ہیں۔ جس جدید معنی میں
ہم مذہب کا استعمال کرتے ہیں یعنی اخلاق کا مجموعہ جس کی بنیاد کسی
الہامی کتاب پر ہو، اُس معنی میں ہندو مذہب مذہب نہیں ہے بلکہ
قدیم یونان اور روما کے عام عقاید کے مانند یہ ایک قسم کی مائی تھولوجی
(اصنام پرستی) ہے۔ یہ مذہب قومی اور مقامی ہے۔ وہ بنی نوع انسان
کو اپنے دائرہ میں لانے کی کوشش نہیں کرتا یہ حق صرف ہندوستانی
اقوام کا ہے کہ وہ ہندو کہلائیں اور جتنی پاکیزگی کے ساتھ ہندوستان
میں اسپر عملدرآمد ہو سکتا ہے اتنا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ برہمنوں کی
تعلیمات کے مطابق ہندوستان ایک مقدس سرزمین ہے اور
دیوتاؤں کے مندر صرف وہیں تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔ وہیں انسان
مکمل زندگی بسر کر سکتا ہے یا عبادت کے ذریعہ سے روحانی فوائد
سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ بعض مقامات خصوصیت سے متبرک
سمجھے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ مقدس ہستیوں کو اپنے
پہلو میں رکھتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہاں خدائی اثرات خاص
طور پر جلوہ گر ہیں۔ مثلاً قدیم اٹلی کے باغات کی طرح ہندوستان کے
تمام دریا مقدس سمجھے جاتے ہیں اور ان کے کناروں پر دیوتاؤں کے
مندر تعمیر کئے جاتے ہیں اور روحانی اثرات سے فیض حاصل کیا جاتا ہے

خوبصورتی کے نقطۂ نظر سے کوئی شے اس قدر حیرت انگیز نہیں
ہو سکتی جس قدر کہ ان قدیم مندروں میں ہندوؤں کی عبادت کا نظارہ
ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص جوش کا اظہار کئے بغیر اسے نہیں دیکھ سکتا
اسی طرح یہ ناممکن ہے کہ وہ جنوبی ہند کے عالیشان مندروں میں لاکھوں
ہندوؤں کے مجمع کو سفید لباس میں اپنا سالانہ تہوار مناتے ہوئے
دیکھے اور قبل از عیسائیت یورپ کے لوگوں کی حالت کا جدید ہندوستان
کی حالت سے موازنہ نہ کرے یا یکسانیتِ تخیل کا اعتراف نہ کرے۔ یہاں
بتوں کی عبادت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اندازہ غیر جہاندیدہ انگریز
پرانی کتابوں کے مطالعہ سے کر سکتا ہے۔ مدورا اور سرنگم کے مندر
اپنی بناوٹ کے اعتبار سے یورپ کی تمام عمارات سے زیادہ حیرت انگیز
اور موثر ہیں اور خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ مردہ چیزیں نہیں ہیں۔
اس کے دروازوں میں خریدار اور دکاندار ابھی تک اپنی تجارت میں
مصروف ہیں اور پرندے اس کے چھجوں میں اپنا بسیرا رکھتے ہیں۔ متبرک
مندر اور متبرک ہاتھی وہاں موجود ہیں۔ پجاری ابھی تک روشن چراغوں
کے گرداگرد بیٹھکر اپنے بھجن گایا کرتے ہیں۔ تہواروں کے موقعوں پر
پیتل کے بیلوں پر تیل ملا جاتا ہے اور جاتریوں کی پیشانیاں قشقہ
سے معطر کی جاتی ہیں۔ دن بھر پھولوں اور لوبان وغیرہ کی خوشبو آتی
رہتی ہے۔ مذہب کا یہ کام قدیم الایام سے جوں کا توں چلا آرہا ہے

شاید لوگوں کی مفلسی کے باعث اس میں کچھ کمی آگئی ہو مگر وہ ابھی تک عوام کی روزانہ زندگی کا زندہ جزو بنا ہوا ہے۔ جب میں نے مڈورا کا مندر دیکھا تو اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے بالآخر بابل کا مندر دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ مصر میں اپیس[1] کی پرستش کیونکر ہوتی ہوگی۔ دیوتاؤں کی یہ پرستش (نہ کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم) ہندو مذہب کی بنیاد ہے اور ابھی تک اس کا نمایاں پہلو بنی ہوئی ہے +

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس کے ساتھ ہی زیادہ تربیت یافتہ برہمنوں میں اس بات کا رجحان بڑھتا جاتا ہے کہ عقاید کو روحانی معانی پہنائے جائیں۔ ویدوں کا فلسفہ اعلیٰ ہے اور مذہبی خیالات میں اصلاح کا معیار پیش کرتا ہے اور اگرچہ برہمنی نظام اخلاق کی کسی تحریری کتاب سے معرا ہے تاہم اعلیٰ ترین نظام سے اس کا تطابق کیا جاسکتا ہے اور یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی بہترین تعلیم کے مشابہ ہے مگر...... روایات باپ بیٹے کے تعلقات یا خاوند بیوی کا رشتہ جس قدر ہندوؤں میں شریفانہ اور متبرک سمجھا جاتا ہے اتنا اور کسی مذہب میں نہیں۔ لہٰذا وہ برائیاں جنہیں صدیوں کے ذہنی جمود نے اضافہ کر دیا ہے، اب جبکہ ذہن بیدار ہو گیا ہے کھلم کھلا برائیاں تسلیم کی جا رہی ہیں اور روشن خیال جدید برہمن از خود عیسائیوں کے بہترین اخلاق کا تتبع کر رہے ہیں اور اُسے اپنے نظام میں داخل کرتے جاتے ہیں۔ مذہبی اصلاح کا یہ پہلو مشترکہ ہے۔ ذہنی جمود کے ساتھ قوم میں بُری رسوم بھی آجاتی ہیں اور جب جمود زائل ہونا شروع ہو جاتا ہے تو جس شے نے اُسے اصلاح پر آمادہ کیا ہو، بالعموم اسی کی نقل کی جاتی ہے +

چنانچہ اب ہم جدید برہمنوں کو بے غرضی کے اخلاقی پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ سچائی، انصاف اور صیانت کے بارے میں بھی ان کی تلقین عیسائیوں سے ملتی جلتی ہے وہ بھی ضمیر کو انسان کا بہترین رہنما قرار دیتے ہیں۔ وہ بہترین چیز کو لیکر اپنے یہاں بہترین روایات کے مطابق کر لیتے ہیں +

اس قسم کی تحریکات میں ایک خطرہ یہ ہے کہ غلامانہ نقل کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نسل کے ہندوؤں میں ہم ایک ایسا فریق پاتے ہیں جس کا مطمح نظر یہ ہے کہ یورپ کی پوری پوری تقلید کی جائے۔ ان میں سے صرف چند ہی اشخاص نے عیسائی مذہب اختیار کیا ہے لیکن اکثر اپنے عقاید سے دستبردار ہونے کے بعد فلسفہ کے مختلف فرقوں کے ہم خیال ہو گئے ہیں۔ جو کم و بیش لا مذہب ہیں بعض اگرچہ اپنے تئیں ہندو کہتے ہیں تاہم انھوں نے ذات پات کی قیود سے اپنے تئیں آزاد کر لیا ہے۔ بنگال اور شمالی ہندوستان میں برہمو سماج والوں کی ایک وسیع جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ جن کے اصول ان فرقوں سے ذرا ہی مختلف ہیں جو خدا کی ہستی کے قائل ہیں ہندوستان کے جنوبی حصص میں جہاں برہمنوں کا زور ہے، اس قسم کی بدعات بے اثر رہی ہیں اور بجائے اس کے وہاں روایتی عقائد کو معقول بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وشنو اور شیو یا دیگر قومی دیوتاؤں کے پجاریوں میں اتنی طاقت موجود ہے یا نہیں کہ وہ اپنے عقائد کو خیر باد کہے بغیر اخلاقی اصلاح کے انقلاب کو برداشت کر لیں، لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ ان میں اصلاح کی تحریک جاری ہے اور نتیجہ اب تک اس قدر نکلا ہے کہ ہندو سوسائٹی کے لیڈروں نے اپنے مذہبی فرقوں کی

---

[1] APIS بیل۔ قدیم مصریوں کا دیوتا

بہبودی اور معاشرتی ترقی میں دلچسپی لینی شروع کردی ہے اور اس کا اظہار ان کوششوں سے ہوسکتا ہے جو تعلیم پھیلانے مذہبی اوقاف کا بہترین انتظام کرنے، مندروں کو سابقہ حالت میں بحال کرنے صغرسنی کی شادی کا سدباب کرنے اور بیواؤں کی شادی کا رواج دینے میں ظاہر کر رہے ہیں +

ایسی تحریک پارسیوں میں بھی جاری ہے۔ اگر یہ لوگ ہندوستان کی پولیٹکل زندگی میں نمایاں حصہ نہ لیتے تو انھیں مشکل سے ہندوستانی قرار دیا جاسکتا تھا۔ آبادی کے لحاظ سے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں اور صرف ایک ہی جگہ پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں بمبئی ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں وہ زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ لیکن اُن کی دولت، اُن کی تجارتی حوصلہ مندی اور ہر قسم کی تعلیم سے مستفید ہونے کی خواہش نے اُنھیں نہایت بارسوخ اور اہم درجہ عطا کر دیا ہے۔ یہ لوگ ایران کے آتش پرستوں کی اولاد ہیں اور ابھی تک قدیم روایات پر قائم ۔ مذہب زرتشت ابتدا میں سادہ اور فلسفیانہ تھا۔ مگر ان دیگر مذاہب کی طرح جو ہندوستان میں آئے ہیں، اس میں بھی کھوٹ اور خراب رسوم شامل ہوگئی ہیں اور اس نے ان بہت سے اوہام باطل کو اختیار کر لیا ہے جو ہندوستانیوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اُن میں سے بعض تو وہ ہیں جو ان کے پہلی مرتبہ آباد ہونے کے موقع پر ہندو راجاؤں نے ان سے زبردستی قبول کروائے تھے اور بعض اس عام جہالت کا نتیجہ ہیں جو سیاسی حالات کے باعث پیدا ہوگئی تھی۔ بہرحال پارسیوں نے سب سے پہلے اس ذہنی آزادی سے فائدہ اُٹھایا جو انگریزی حکومت کا طغرائے امتیاز رہی ہے اور چونکہ وہ تجارت پیشہ ہیں اس لئے موجودہ زمانہ کے تجارتی دور سے انھوں نے دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے اور اب وہ خاصے مالدار ہوگئے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بااخلاق ہونے اور قدرتاً نیکی کی جانب رجوع ہونے کا یہ اثر ہے کہ اب وہ پھر اپنے مذہب کی قدیم سادگی کو زندہ کرنا چاہتے ہیں اور ہندوؤں سے کہیں زیادہ ان میں یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ اپنے عقاید کو روحانی معانی پہنائیں اور اپنے رسوم و رواج کی اصلاح کریں۔ جس شخص کو بھی کسی تعلیم یافتہ پارسی کے ساتھ "برج خموشاں" میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اُس نے اندازہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے مُردوں کو کھلا رکھنے کی قدیم رسم کی تشریح کس فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں

پارسیوں اور جنوبی ہند کے عیسائیوں کے ذکر کو میں طوالت نہیں دینا چاہتا اس لئے کہ مجھے ان دونوں کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی وسیع آبادی ہی انھیں عام توجہ کا مستحق ٹھہراتی ہے +

مگر میری خاص توجہ قدرتی طور پر مسلمانوں کی جانب مبذول رہی جیسا کہ سب کو معلوم ہے مسلمان دو مختلف راستوں سے اور دو مختلف حالات میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ پہلی مرتبہ وہ عرب تجار کی حیثیت سے اس کے مغربی ساحل پر نمودار ہوئے یہ لوگ اسلام پھیلانے اور روپیہ پیدا کرنے کی غرض سے آئے تھے یہ پُرامن مبلغین تھے جنھوں نے اپنی کامیابی کا دارومدار تلوار پر رکھنے کے بجائے ترغیب و تعلیم پر رکھا تھا اور اس طریقے سے جو اسلام پھیلا اس کا وجود آج بھی مغربی ساحل پر بمبئی کے کوکنیوں مالابار کے مابلاؤں اور سیلون کے موروں میں ملتا ہے۔ یہ سب لوگ خوشحال اور تجارت پیشہ ہیں اور تعمیرات کے کاموں میں بہت شہرت رکھتے ہیں +

کولمبو میں مجھے یہ دیکھکر بہت دلچسپی پیدا ہوئی کہ آٹھویں اور نویں صدیوں کے آباد ہونے والے عرب تجار کی اولاد عرب کی تجارتی روایات کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ تمام سیلون میں ان کی تعداد ۲½ لاکھ ہوگی اور وہ نہایت خوشحال ہیں۔ وہ بہت قدامت پسند ہیں اور دین کے بجائے اس دنیا کے کاموں میں بہت انہماک رکھتے ہیں۔ جدید خیالات کا ان پر معمولی اثر پڑا ہے اور یہی عربی اور اُن کے جلا وطن ساتھیوں کا طفیل سمجھنا چاہئے جنھیں اسلامی دنیا کے وسیع حصہ کا تجربہ تھا اور جو مذہب کے لئے سینہ سپر ہو چکے تھے اُن کی آمد سے پیشتر جزیرہ کے مسلمان کبھی تبادلہ خیالات کی غرض سے مجتمع نہیں ہوئے اور بہت کم لوگ ایسے تھے جنکے بچے اسکول میں جاکر پڑھتے۔ مگر جلا وطنیوں کی تقلید کا آغاز جلد ہی ہو گیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ عربوں میں تعلیم کی خواہش پیدا ہوئی اور باقی مسلمانوں سے تعلقات رکھنے کا خیال آیا۔ عصر کے معنات کا یہ عجیب و غریب نتیجہ ہوگا۔ اگر اُس کے محب وطن سرداروں کی تکالیف جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں میں مذہبی آزادی کے خیالات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ لیکن یہی وہ بات ہے جو ظہور میں آرہی ہے کاش یہاں کے عرب دور دور پھیل جائیں کیونکہ ان کا تجارتی شوق اُن کی زندگی کا نہایت خوشگوار عنصر ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اسی چیز کی بہت کمی ہے!

سیلون سے جب میں براعظم کی طرف گیا تو مجھے جو مسلمان ملے وہ شمالی حملہ آوروں کی اولاد سے تھے۔ یہ لوگ مذکورۂ بالا تجارت پیشہ مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے اور نہ ویسے خوشحال دکھائی دیتے تھے۔ اور نہ ترقی کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ صوبہ مدراس کے مسلمان ہندوستان میں سب سے زیادہ غریب ہیں وہ مغلوں کے انتہائی عروج کے زمانہ میں یہاں آئے تھے۔ یہ مبلغین یا نومسلموں کی اولاد نہیں ہیں بلکہ شمالی افواج کی اولاد ہیں اور چونکہ ان کی سرکاری ملازمت جاتی رہی ہے اس لئے وہ افلاس کے باعث بہت جلد صفحۂ ہستی سے نابید ہو رہے ہیں۔ تانجور اور ترچناپلی جیسے شہروں کے مسلمانوں کی حالت نہایت ہی قابل رحم ہے۔ وہ ہندوؤں کی آبادی سے گھرے ہوئے ہیں، روایتی صنعتوں سے بالکل معرا ہیں، تجارتی شوق سے بالکل بے بہرہ ہیں اور تلوار کے ہنر کے سوائے باقی ہر ہنر سے ناواقف ہیں اور گونگوں کی طرح اپنی تباہی کے منتظر ہیں۔ اُن میں جو چند مالدار صاحب جائداد اشخاص دکھائی دیتے ہیں وہ دن بدن کم ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ محتاج اور غریب رشتہ داروں کی فوج کی فوج ان پر گزر اوقات کرتی ہے۔ وہ ہندو مہاجنوں کے مقروض رہتے ہیں، سال بسال ان کے قرضہ جات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جو کچھ بچتا ہے اُسے عدالتیں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ جو لوگ صاحب جائداد نہیں ہیں معمولی قسم کی محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ نہایت سخت زندگی ہے مگر اس سے چھٹکارا کہاں ہو سکتا ہے۔ ؟ اُن کی قسمت کا دارومدار بظاہر اس قانون پر ہے کہ جو شخص روزی نہیں کما سکتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جنوبی ہندوستان کے مسلمان اُن خرابیوں کے انتہائی نتائج پیش کرتے ہیں جو کم و بیش انکی تمام قوم میں پائی جاتی ہیں۔ جنوب میں اُن کی تعداد بہت کم ہے، اور وہ اسقدر محتاج ہیں کہ اُن میں کشمکش حیات کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی شمال میں انکی حالت کا خطرہ انھیں نئی جد و جہد کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔

(باقی آئندہ) ض، ا، ب، بی۔ اے

جفا جفا کی طرح ہو ستم ستم کی طرح
یہ کیا ہے بھیٹ پڑے عاشقی پہ غم کی طرح

چند روز لکھنؤ میں!

بعد مدت کے نظر آیا دیارِ لکھنؤ!
دل فدائے لکھنؤ! آنکھیں نثارِ لکھنؤ!

عرش ساماں کیوں نہو خاکِ دیارِ لکھنؤ
ہے بہارِ خلد سے بڑھکر بہارِ لکھنؤ!

مٹ چکے ہیں گرچہ تاج و تاجدارِ لکھنؤ
پھر بھی زندہ ہے ابھی روحِ وقارِ لکھنؤ

مشرقی رنگِ تمدن کی ہے خالص یادگار
کیوں نہ ہو ہر مشرقی دل سے نثارِ لکھنؤ

نو بہارِ خلد کے کھوئے ہوئے کچھ خواب ہیں
مایۂ حیرت نہیں نقش و نگارِ لکھنؤ

یہ محل اسلاف کی تہذیب کا گہوارہ ہیں
ہند میں کافی ہے یہ تنہا وقارِ لکھنؤ

یہ فلک رتبہ مکاں! یہ خلد ساماں گلستاں!
رشکِ مہر و ماہ ہیں نقش و نگارِ لکھنؤ

وہ ہے تنہا آسماں پر ایک یہاں ہیں لاکھوں نہاں
کیوں نہو زہرہ کو رشکِ نغمہ زارِ لکھنؤ

"ماہ" در آغوش ہے ہر ذرہ اس کی خاک کا
اے زہے "حسن نظر گاہِ" دیارِ لکھنؤ!

محفلِ شعر و ادب ہے مستِ صہبائے نیاز
ہے "نگارِ" لکھنؤ! بیشک نگارِ لکھنؤ

خامۂ جالب کہ ہے جس پر صحافت کو غرور
ایک مدت سے ہے مخمورِ بہارِ لکھنؤ

کس ادب سے لب پر آتا ہے مرے احسن کا نام
جن کی ہستی ہے فروغِ افتخارِ لکھنؤ

حضرت شہزادۂ باقر علیخاں کا خلوص
دل میں ہے مہماں بطورِ یادگارِ لکھنؤ

چونک کر خوابِ لحد سے اپنے ویرانوں کو دیکھ!
جانِ عالم! آہ او جانِ بہارِ لکھنؤ!!

آہ میری پارسائی کی یہ سادہ بیکسی!
ہائے یہ رنگینیٔ لیل و نہارِ لکھنؤ!

مجھکو اِن روشن شبستانوں میں مرجانے بھی دے!
اے طرب آبادِ ہند! اے حسن زارِ لکھنؤ!

ایک حسن نازنیں تڑپائیگا برسوں ہمیں
یہ "خلش" دل میں رہیگی یادگارِ لکھنؤ

اگلی عظمت یاد آتی ہے یہ رونق دیکھکر
ہم تو اختر اب بھی ہیں ماتم گسارِ لکھنؤ

اختر شیرانی

عہدِ گزشتہ کی یاد

اب کہاں دورِ بادۂ گلفام — اب کہاں وہ سحر کجا وہ شام
اب کہاں حسن و عشق کی باتیں — اب کہاں زندگی کا لطفِ دوام
اب کہاں شعر و شاعری کا جنوں — اب کہاں آرزوئے حُسنِ کلام
وہ زمانہ بھی یاد ہے مجھکو — فکرِ اشعار میں تھی نیند حرام
گاہ اقبال کی نواؤں میں گم — گاہ غالب کے میکدے میں قیام
بتکدے میں کبھی سیاہ عمل — صومعہ میں کبھی مہِ اسلام
فلسفے کی فضا میں گہ پرواز — گاہ مذہب کے دشت میں ضرغام
گاہ آغوشِ حسن میں بے کل — گاہ راہِ طلب میں بے آرام
اب نہ وہ دل نہ وہ زمانہ ہے — اللہ اللہ رے گردشِ ایام
فکرِ دنیا سے کس کو فرصت ہے — یاد ہے اب کسے غزل کا نام
ذوقؔ و غالبؔ کے شعر بھول گئے — رہ گئے یاد دفتری احکام
شعر کہئے کہ نوکری کیجیے — دل کی سنئے کہ کیجیے پیٹ کا کام
آج فرصت کی شکل دیکھی تھی — چند اشعار ہو گئے ارقام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا — توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

"زہرِ غم کر چکا ہے میرا کام" — اے دلِ ناتواں چلا میں تھام
حسن پر جاں نثار کرتے ہیں — کتنا محبوب ہے یہ خوں آشام
تم کو لاتی جو چاند کے بدلے — میرے غمخانہ میں نہ آئی وہ شام
بچ کے چل شہرِ حسن سے اے دل — کہ یہاں خنجر و تفنگ ہے عام
گلستاں میں بہار آ بھی چکی — ہائے لایا نہ کوئی تیرا پیام
اُن کے غم میں وہ لطفِ مے نہ رہا — اب کہیں اس کو کس بنا پہ حرام
تیری شمشیر نے گلے مل کر — کس ادا سے کیا ہے کام تمام

آہ عاشق کبھی نظیرؔ بھی تھا
سنتے ہیں اب بھی ہے مگر ناکام

نظیر لودھیانوی

غزلیات

آزاد انصاری

کیا خاک مان لوں کہ وہ نامہرباں نہ تھا
اک طرز التفات سے کیا کچھ عیاں نہ تھا

یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی
یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھا

اُمید کے لحاظ سے میرا گماں غلط
برتاؤ کے خیال سے تو مہرباں نہ تھا

تم آئے اور بزم کا نقشہ بدل گیا
دم بھر میں وہ ترانۂ طرب وہ سماں نہ تھا

مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی

بالیں پہ نہ لائے کوئی اُسے کیا فائدہ شرما جائیگا
اب حال زبون و زار مرا اُس سے نہ دیکھا جائیگا

وہ صید ضعیف و لاغر ہوں سب دیکھ کے مجھکو کہتے ہیں
اس بیچارے سے زخمی ہو کر کیونکر تڑپا جائیگا

میں اُس سے کہوں دکھ درد ترا بس میری تو ایدل توبہ ہے
سب آئی گئی مجھپر ہوگی کمبخت ترا کیا جائیگا

آہ سوزاں روکی تو روکی آنسو پینا قہر ہوا
اب چھالے پہ چھالا چھالے سے چھالا پڑتا جلتا جائیگا

فریاد کا شنوا کوئی نہیں بیکس کا سہارا کوئی نہیں
کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائیگا

کیا عرض تمنا کا حاصل وہ ایک ہی پرفن ہے اول
یا باتیں بنائی جائیں گی یا باتوں میں ٹالا جائیگا

دیدار کی حسرت جو ہے سو ہے دل کی تپش کو کیا کیجئے
بیہوشی سی چھا جائیگی جب پردہ اٹھایا جائیگا

الزام ندو ناراض نہ ہو اس دل سے بہت مجبور ہوئے
اب تم جو سہارا دو اُٹھیں یوں ہم سے نہ اُٹھا جائیگا

جب یاد دلایا روز جزا کافر نے کہا اور ہنسکے کہا
سی جائیں گے تیرے ہونٹ اثر جب نام وفا آجائیگا

اثر رامپوری

پہلی سی درد عشق میں لذت نہیں رہی
یعنی جو زندگی کی تھی صورت نہیں رہی

عہد جفا میں تیرے ہوئے لوگ ہوشیار
دنیا فریب خوردۂ الفت نہیں رہی

خوگر جفائے عشق کا جب دل مرا ہوا
ایذا پسند ان کی طبیعت نہیں رہی

مجکو جواب طاقت رفتار دے گئی
جب دو قدم بھی منزل الفت نہیں رہی

سچ تو یہ ہے کہ میری وفا کے جواب میں
اُن کی جفا کی کوئی حقیقت نہیں رہی

دیکھا جو ہم نے عالمِ تمکینِ حسنِ یار
عرضِ نیازِ عشق کی جرأت نہیں رہی

وہ لطف دردِ عشق میں پایا ہے اے اثر
اظہارِ دردِ عشق کی حاجت نہیں رہی

اکبر حیدری

سراپا سوز بنکر زندگی کا ساز پیدا کر
شکستِ رنگِ رُخ سے بھی کوئی آواز پیدا کر

ابھی تک منتظر ہے عالمِ نشو و نما تیرا
بھلا دے کاہشِ انجام کو آغاز پیدا کر

جسے حدِ نظر تک کامرانی کی تمنا ہو
فضائے عالمِ امکاں میں وہ پرواز پیدا کر

بھلا دے اپنی پستی کو مگر شوقِ بلندی میں
مٹا دے اپنی ہستی کو مگر اعزاز پیدا کر

ہوا کی جنبشوں پر قدرتِ رفتار ہو جس کو
شکستِ آہ سے ایسی کوئی آواز پیدا کر

ایمن سلونوی

شوقِ ایذا طلبی کا بھی نہ ارماں نکلا
درد بھی دل میں بہ اندازۂ حرماں نکلا

آہ ہستی دلِ مرحوم کی پھر یاد آئی تو
آج اک قطرۂ خوں پھر سرِ مژگاں نکلا

منتشر کر دیا سب رازِ خزاں نے آکر
پتہ پتہ مرے گلشن کا پریشاں نکلا

ہائے وہ دل جسے سمجھا تھا میں سرمایۂ زیست
اس کا سرمایہ فقط نالۂ سوزاں نکلا

خوفِ انجامِ محبت کو بھلایا غم نے
جس کو دشوار سمجھتے تھے وہ آساں نکلا

موت نے توڑ کے چھوڑا مری وحشت کا طلسم
پھر نہ صحرا نظر آیا نہ وہ زنداں نکلا

بھڑکا سو بار چراغِ سرِ تربت میرا
جب جہاں میں کسی ناشاد کا ارماں نکلا

ثاقب جالندہری

خیالِ دوست میں اس درجہ کھو گیا ہوں میں
کہ ناشناسِ تمنائے ماسوا ہوں میں

نظر ہی جانتی ہے حاصلِ نظارۂ دوست
زباں سے کہہ نہیں سکتا جو دیکھتا ہوں میں

مجھے وہ کب ہی گوارا جو ہے پسند انھیں
انھیں پسند وہ کب ہے جو چاہتا ہوں میں

کچھ اور حوصلۂ جور ہیں زمانے کو
اگرچہ دستِ زمانہ سے مٹ گیا ہوں میں

شبِ فراق میں اللہ رے اضطراب مرا
بگڑ کے دامنِ محشر کو کھینچتا ہوں میں

مزا تو جب ہے وہ آمادۂ مداوا ہوں / اِدھر پکار اٹھے درد لا دوا ہوں میں

یہی اُمید تو ہے باعث قیام حیات / تمھارے وعدۂ فردا پہ جی رہا ہوں میں

بذات خود نہیں شمس و قمر۔ مگر ثاقب / سپہر عالم اسباب کی ضیا ہوں میں

راز رامپوری

تسلی سے نہیں خوفِ حوادث دل سے نکلے گا / خدا کا کام تجھ سے ناخدا مشکل سے نکلے گا

جہان عشق کے آئین کی تشریح ہوتی ہے / وہ فقرا تم بھی سننا جو لب بسمل سے نکلے گا

شب غربت مری کب تک الٰہی طول کھینچے گی / دھواں کب تک چراغ سر حد منزل سے نکلے گا

جواب شوق بن اے بے نیازی مطمئن ہو نہیں / دکھا دونگا نکلنے والا جب محفل سے نکلے گا

ہر اک ذرہ میں رنگ آجائیگا تصویر لیلیٰ کا / اگر مجنوں حدودِ ناقہ و محمل سے نکلے گا

اٹھا کر در سے پھر آنے کی بابت پوچھتے کیا ہو / نہ سمجھو گے وہ فقرا جو لب سائل سے نکلے گا

ارادہ تھا کہ میں اعلان تسکین نظر کر دوں / مگر اے راز ان کا راز کیونکر دل سے نکلے گا

شوق مرادآبادی

دیر و حرم سے شوق نکالے ہوئے تو ہیں / اس پر بھی اپنے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

کیا رنگ لائے دیکھئے سینہ کی یہ فضا / زخم کہن فراق میں آلے ہوئے تو ہیں

بس اب تمھارے ہاتھ ہے شرم گناہ عشق / رسوا تمھاری چاہنے والے ہوئے تو ہیں

کر تو رہے ہیں ضبط تصور کسی کا ہم / بے اختیاریوں کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

اے جوشِ عشق شوق کو منزل نصیب ہو / راہ طلب میں جان کے لالے ہوئے تو ہیں

فرخ بنارسی ساڑی

کیوں نہ ہو ایسی بندگی پر ناز / جسمیں حاصل ہو لطف راز و نیاز

میری ہستی ہے ایک نغمۂ راز / پردۂ ساز کن کی ہوں آواز

جستجو میں رہی تری مدہوش / ہم حقیقت سمجھ سکے نہ مجاز

فکر ہستی سے بے نیاز کیا / اے غم عشق تیری عمر دراز

ہمہ تن گوش بزم فطرت ہے / کس نے چھیڑا ہے ساز بے آواز

میری ہستی عجیب ہستی ہے | خود ہے جویائے رازِ خودی راز
موت ہے زندگی کا دورِ جدید | میرا انجام ہے مرا آغاز
عکس آئینہ تجلی ہوں | ہائے رے اتصالِ ناز و نیاز
حدِ منزل وہی ہے اے فرخ | ختم ہو جائے جس جگہ پرواز

نیاز فتحپوری

قواعد رسالہ نگار

۱ ۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ ۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا

۳ ۔ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جنپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کردیے جاتے ہین

۴ ۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ ۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئن ۔

۶ ۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ ۔ **نگار**

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخنامہ اجرت اشتہارات	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	(۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے	ایک مرتبہ	۱۵ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

جلد ۱۳ - شمارہ ۴

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول ہعہ

فہرست مضامین اپریل ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۳	اپریل ۱۹۲۸ء	شمار ۴

ملاحظات

ترقیاں دو قسم کی ہیں، ظاہری و معنوی جنھیں زیادہ اصطلاحی صورت میں مادی و روحانی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری ترقی کا معیار یہ ہے کہ دولت وافر ہو، اسباب راحت فراواں ہوں، اور سامان عیش و تنعم کثیر۔ معنوی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ قلب پُرسکون ہو، دماغ مطمئن ہو اور روح بے نیاز و مستغنی۔ ہرچند دونوں کا اجتماع محال نہیں، لیکن کمیاب ضرور ہے، اس لئے جو لوگ زیادہ سنجیدہ اور متین ہیں، وہ ہمیشہ روح کو جسم پر ترجیح دیتے ہیں اور دیبا و حریر کی نرمی سے زیادہ خشونت گلیم کو پسند کرتے ہیں۔ یہ ہے فلسفہ اخلاقیین کا اور غالباً بڑی حد تک درست ہے۔ اڈیسن اور فورڈ کا مسلک اس سے بالکل جُدا ہے، ان کے ہاں مادی ترقی بھی روحانی ترقی کی طرح لامحدود شے ہے اور انکا قول ہے کہ دولت کی فراوانی، ہئیت اجتماعی کا استحکام ہے اور یہی وہ مقصد اصلی فطرت کا ہے جسے نہ مسیح کا درس رہبانیت پورا کر سکا، نہ چنگیز و سکندر کی خون آشام تلوار ——— یہ نظریہ بھی بہت خوشنما اور قرین عقل معلوم ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں ایک جماعت اور بھی ہے جو نہ اُس فلسفہ کی لذت آشنا ہے، نہ اِس نظریہ کی یعنی نہ اس غریب کے پاس دولت ہے نہ روحانیت، نہ اسباب راحت روح ہیں نہ سامان عشرتِ جسم پھر لطف یہ ہے کہ وہ زندہ بھی رہنا چاہتی ہے اور لطف و آسائش کے ساتھ!!

مارا ہنوز عربدہ با خویشتن بس است

میں نے اس وقت یہ ذکر کیوں چھیڑا؟

نگار تجارتی اصول کو پیش نظر رکھ کر جاری کیا گیا اور اس وقت تک اسی اصول پر چلایا جا رہا ہے ظاہری ترقی کی لحاظ سے غالباً یہ امر کم امید افزا نہیں کہ اب وہ ایک بجلی سے چل سکنے والی پریس مشین کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، اسی طرح معنوی ترقی کے لحاظ سے دیکھئے تو یہ حقیقت کم دلچسپ نہیں کہ شاید ہی ہندوستان کا کوئی رسالہ ایسا ہو جو اس کی ادائے سربلندی سے نہ جلتا ہو۔ لیکن باینہمہ حقیقی معنے میں مجھے نہ اس پر اطمینان ہے نہ اس پر افتخار، کیونکہ مادی ترقی کے لحاظ سے اگر ایک طرف دولت قارون میرا نصب العین ہے تو معنوی ارتقا کی حیثیت سے دوسری طرف میرا ارادہ "الہامات" پر چشمک زن نظر آتا ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ ممکن ہے لیکن محال، یہ محال ہے، مگر ممکن۔ یعنی آج قارون کی طرح بہت سے دولتمند موجود ہیں لیکن میں نہیں ہو سکتا اور آیات وجدانی کی صورت سے میں بھی اکثر چیزیں پیش کر سکتا ہوں مگر خود نبی کو ان پر ایمان لانے میں تامل ہوگا، چہ جائیکہ ساری دنیا۔

الغرض یہ ہے میری کشمکش کا عالم جب سے لکھنؤ میں آنے کے بعد نگار اور نگار پریس دونوں کو سنبھالنے کی خدمت میرے سپرد ہوئی ہے اور کس قدر شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ متوسط جماعت کی بے بالی و پری بھی کتنا بڑا قہر ہے۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ اس کے کسی فرد میں ولولۂ پرواز ضرورت سے زیادہ ودیعت کیا گیا ہو۔

ناظرین نگار کے سامنے یہ افسانہ صرف اس لئے چھیڑا جاتا ہے کہ اگر وہ توسیع اشاعت کو اپنا فرض نہیں سمجھتے تو کم از کم وہ یہ تو آسانی سے کر سکتے ہیں کہ اگر انھیں کبھی پریس سے کام لینے کی ضرورت پڑے تو سب سے پہلے نگار پریس کو یاد کریں، جو بہ نسبت دیگر مطابع کے یقیناً زیادہ مستحق اعانت ہے۔

نگار اور اڈیٹر نگار کے خلاف پروپگنڈا ہمیشہ ہوا ہے اور ہوتا رہیگا۔ اس لئے جائے حیرت نہیں اگر مقامی فضا سے بھی کبھی کبھی اس نوع کی آوازیں سننے میں آئیں۔ میرے بعض احباب نے خصوصیت کے ساتھ مجھے متوجہ کرنا چاہا تاکہ میں کوئی جواب دوں، لیکن انھیں شاید اس کا علم نہیں کہ اس باب میں میرا مسلک ہمیشہ "در گذار تا بمیرد در رنج خود پرستی" رہا ہے۔ اور میں ایسی آوازوں کو صرف "صیحۂ موت" سمجھتا ہوں۔

اس ماہ کے مضامین میں فلسفۂ مذہب، لارڈ ریپن، اور نقد الشعر، مسلسل چلے آ رہے ہیں اس لئے مزید تقریب و تعارف کی ضرورت نہیں۔ یہی حال چنگاری اور ڈائری کا بھی ہے۔ فسانۂ "قطرۂ آتشیں" کی خصوصیات کو اسی جگہ نوٹ کے ذریعہ سے ظاہر

کر دیا گیا ہے۔ لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر ناقص تنقیدی مضمون ہے جسمیں بلا رو رعایت جناب آسی کی شاعری کے متعلق انہیں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ممکن ہے لکھنؤ کے بعض حضرات اس کو معاندانہ نگاہ سے دیکھیں، لیکن ان کی کج بینی کا ذمہ دار [illegible] ۔ چہرہ گویاں سرف نگاہی رنگ کا مضمون سمجھکر مطالعہ کرنا چاہیے۔ ملکۂ "نرگس بیگم" تاریخی مضمون ہے [illegible] اہم ہیں۔ جناب نرگس کا مضمون کلام درد کے متعلق خاص چیز ہے اور ایک ایسے "فتنۂ لغویہ" کا سدباب ہے جس کو اگر اسی کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کچھ زمانہ کے بعد اس کے اثرات کو مٹانا دشوار ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا حبیب الرحمان شروانی جو اپنی سنجیدگی ذوق اور انصاف پسندی کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں، عملاً ان اغلاط کے محو کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔ جو نظامی پریس بدایوں کے نسخہ میں پائی جاتی ہیں اور جن کی سب سے بڑی ذمہ داری [illegible] پر اس لئے عاید ہوتی ہے کہ انھوں نے اس نسخہ کے صحت کی توثیق فرمائی ہے۔

آئندہ ماہ کی اشاعت میں [illegible] مضمون تذکرۂ آبحیات پر درج کیا جائے گا جس میں ناقابل تردید دلایل سے کام لیکر مولف آبحیات (مولوی محمد حسین آزاد) کی غلط بیانیوں، وسیہ کاریوں اور تحریف نگاریوں کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اردو کا یہ سب سے زیادہ مشہور تذکرہ کس قدر پر اغلاط اور گمراہ کن ہے۔ اسی موضوع پر ایک مضمون جناب امتیاز احمد صاحب بی اے (علیگ) کا بھی ہوگا جس میں موصوف نے مولف آبحیات کی صرف ان درازدستیوں کو دکھایا ہے جو درد کے ساتھ روا رکھی گئی ہیں۔

شاعر کا ترانہ۔ خواجہ مسعود علی زدتی بی اے (علیگ) کا ہے جسمیں انھوں نے ایک طرف اپنے فطرت پرست ذوق کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا ہے، اور دوسری طرف ایک شاعر کے ذہنی مشاغل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نظم ہونے کے لحاظ سے یہ ترانہ خوب ہے۔ جناب قیسر کا قطعہ خوشی اور غم ان کے مصلحانہ رنگ میں ہے اور دلچسپ ہے۔ جناب عزیز کی نظم۔ دامن کوہ ایک طویل نظم کا ٹکڑا ہے جس سے ان کا ابداعی رنگ ظاہر ہے۔ واردات میں امین حزیں کا وہی پیام مستور ہے جس کے وہ قدیم علمبردار ہیں۔ تسکین جاوید۔ روش صدیقی کی نظم ہے اور اچھی ہے۔ غزلوں میں جناب اثر لکھنوی کی غزل خاص مرتبہ کی ہے۔ جگر بریلوی کی غزل بھی قابل داد ہے اور دیگر شعرا کی غزلوں میں بھی بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں

امین سلونوی جن کے متعلق نگار کی کسی گزشتہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ نگار کے شعبۂ نظم سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اب علحدہ ہو گئے ہیں اور ان کو ادارۂ نگار سے کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہا ہے

نیاز فتحپوری

"قطرۂ آتشیں"

(فسانہ)

گزشتہ قرن کے اخیر میں سرزمین ہنگری نے دو بھائی کاردلی کسوالڈی اور الگزنڈر ایسے پیدا کئے جن پر وہاں کے ادبیات کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ کاردلی ہر چند خصوصیت کے ساتھ اپنی روایات تمثیلی کی وجہ سے بہت مشہور ہوا، لیکن اس نے اپنی مختصر زندگی میں جو ہمیشہ خطرات سے گھری رہی — بعض ایسے عجیب و غریب فسانے بھی لکھے جن پر ہنگاری ادب جس قدر فخر کرے کم ہے۔

آج کی صحبت میں اسی کے ایک افسانہ کا ترجمہ (جسے میں نے عربی سے لیا ہے) درج کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ جب ایک ماہر افسانہ نویس کسی ایک واقعہ میں مرکزیت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ کس قدر اہتمام کرتا ہے اور کس طرح ماحول کو آہستہ آہستہ سمیٹ کر اس مرکز میں جذب کر دیتا ہے جسے اس نے ہدف خیال بنایا تھا۔ مصنف نے اس قصہ کا عنوان پوشیدہ زخم رکھا تھا میں نے اُسے "قطرۂ آتشیں" سے بدل دیا ہے

نیاز فتحپوری

ایک دن طلوع آفتاب سے قبل، بہت سویرے ایک شخص ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس آیا اس حال میں کہ وہ ابھی تک بیدار نہ ہوا تھا دروازہ پر پہونچکر اُس نے ڈاکٹر صاحب کے خادم سے التجا کی کہ "اپنے آقا کو جگا دو کیونکہ میں نہایت ہی سخت مرض لیکر آیا ہوں اور اسپر اسی وقت عمل جراحی ہونا چاہیے"

جب ڈاکٹر جاگا اور اس کو ایسی شدید ضرورت کا علم ہوا تو اس نے فوراً کپڑے پہنے اور خادم کو حکم دیا کہ آنے والے کو اندر بھیجدے نووارد کے خدوخال وضع و لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت بلند طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے چہرہ کی زردی اعصاب کے ہیجان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کو کوئی شدید تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا داہنا ہات بندھا ہوا تھا اور گلے میں ایک رومال ڈالکر اسپر اُسے سہارا دیکر لٹکا لیا تھا۔ اور باوجودیکہ وہ حد درجہ صبر و ضبط سے کام لے رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی بے چینی کراہ کبھی کبھی نکل ہی جاتی تھی۔

ڈاکٹر نے نہایت عزت و احترام سے اس کا استقبال کیا اور بولا کہ "تشریف رکھئے اور فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں"

"ایک ہفتہ سے میرے ہاتھ میں اس قدر شدید درد ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی پلک نہیں جھپکا سکا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ درد سرطان

کی وجہ سے ہے یا کسی اور بیماری کی وجہ سے پہلے ہلکا ہلکا قابل برداشت تھا۔ لیکن اب یہ عالم ہے کہ اُسکی برداشت ممکن ہی نہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ وہ ہر ساعت بڑھتا جاتا ہے اور اُسی کے ساتھ کرب و ایذا کا عذاب بھی مجھے ہلاک کئے ڈالتا ہے۔ اس لئے خدا کے لئے کوئی تدبیر کیجئے۔ میرا ہاتھ کاٹ ڈالئے آگ سے داغ دیجئے، بہر حال جو کچھ کرنا ہو جلد کیجئے۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا، اگر جان نکلی"

ڈاکٹر نے اُسے تسکین دی اور کہا کہ "یہ مرض ایسا سخت نہیں ہے اور جراحی کی ضرورت نہ ہوگی، آپ مطمئن رہیں"

—— نہیں نہیں، جراحی کی ضرورت یقیناً ہوگی، اور میں آپ کے پاس اسی لئے آیا ہوں کہ آپ میرا ہاتھ کاٹ ڈالئے تاکہ اس عذاب سے نجات مل جائے" یہ کہتے ہوئے اُس نے رومال سے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور اُس کو اٹھا کر بولا۔ آپ کو غالباً یہ دیکھکر تعجب ہوگا کہ ہاتھ میں بظاہر کوئی زخم یا درد کا سبب موجود نہیں ہے۔ مگر میرا مرض ہی قیاس سے باہر ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل عجیب وغریب"

ڈاکٹر نے نہایت غور سے اس کے ہاتھ کو دیکھا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس میں کوئی علامت کسی مرض کی نہ تھی اور بائیں ہاتھ کی طرح وہ بھی بالکل صحیح تھا اس نے دریافت کیا کہ "درد کس جگہ محسوس ہوتا ہے"؟۔ اس نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھایا اور دونوں وریدوں کے درمیان انگلی کے اشارہ سے ایک جگہ کو متعین کیا۔ ڈاکٹر نے حد درجہ نرمی سے اس جگہ کو چھوا لیکن وہ اس کی بھی تاب نہ لا سکا اور درد کی شدت سے چیخ اُٹھا

ڈاکٹر نے کہا "سخت حیرت ہے کہ مجھے آپ کے ہاتھ میں کسی مرض کا ہونا معلوم نہیں ہوتا"

—— "لیکن میں درد سے تڑپ رہا ہوں"

ڈاکٹر نے خورد بین اُٹھا کر اس سے اس کے ہاتھ کا نہایت غور سے معائنہ کیا، تھرمامیٹر سے اُس کا درجۂ حرارت دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولا کہ جلد اور شرائین بہترین حالت میں ہیں۔ ورم و التہاب کا کوئی نشان نہیں ہے اور ہاتھ ہر مرض سے پاک ہے"

—— "لیکن اس حصۂ جسم میں جہاں درد ہے سرخی تو معلوم ہوتی ہے"

—— "کہاں ہے"

اس نے ایک گول چھوٹا سا دائرہ انگلی سے بتاتے ہوئے کہا کہ "اس جگہ"

ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس شخص کو اگر کوئی بیماری ہے تو عقل کی خرابی کی ہے اس لئے اس نے کچھ تامل کرکے جواب دیا کہ کہ آپ کچھ دن شہر میں قیام کریں میں علاج میں اپنی پوری کوشش صرف کر دونگا"

—— "میں تو ایک لمحہ کا انتظار نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے دیوانہ نہ سمجھئے اور نشتر نکال کر اتنا حصہ گوشت کا اور جی چاہے تو ہڈی بھی نکال کر پھینک دیجئے"

—— "میں تو یہ نہیں کر سکتا"

—— "کیوں؟"

—— "اس لئے کہ آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح صحیح و سالم ہے اور اس میں جراحی کی ضرورت نہیں"

یہ سنکر اس آدمی نے اپنی جیب سے ہزار روپیہ کا نوٹ نکالا اور سامنے میز پر رکھ کر بولا کہ آپ مجھے شاید دیوانہ سمجھتے ہیں لیکن میں کامل صحت عقل کی حالت میں ہوں آپ عمل جراحی کے لئے آمادہ ہوں تو یہ حقیر ہدیہ پیش کرنے کے لئے طیار ہوں"

"میں عضو صحیح میں نشتر کا استعمال نہیں کر سکتا خواہ دولت قارون ہی کیوں نہ ملے"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ میرے ضمیر اور میرے پیشہ کے آداب کے خلاف ہے"

اچھا تو پھر میں ہی خود عمل جراحی کرونگا ہر چند میرا بایاں ہاتھ اچھی طرح کام نہ دیگا۔ لیکن آپ یہ تو کرینگے کہ جب میں گوشت کا دردمند حصہ کاٹ ڈالوں تو زخم کا علاج آپ کریں" یہ کہکر اُس نے فوراً اپنی آستین چڑہائی اور قبل اس کے ڈاکٹر روکے جیب سے چاقو نکال کر ہاتھ میں تیرا دیا۔ ڈاکٹر نے یہ دیکھ کر کہ کہیں کوئی ورید یا شریان نہ کٹ جائے، فوراً چیخ کر کہا کہ "ٹھہر جائے اگر آپ کو ایسا ہی اصرار ہے تو میں اس عمل کو پورا کئے دیتا ہوں" یہ کہکر اس نے اپنی آستین چڑہائی اور کہا کہ اپنا منہ پھیر لیجئے اس خیال سے کہ خون بہتا ہوا دیکھ کر متاثر نہ ہو، لیکن اُس نے کہا کہ "اس کی ضرورت نہیں۔ بلکہ مجھے دیکھتے رہنا چاہئے۔ تاکہ میں صحیح جگہ آپ کو بتا سکوں"

ڈاکٹر نے اپنا عمل شروع کیا۔ اور وہ نہایت اطمینان سے بغیر کسی خوف و ہراس، یا لرزہ و ارتعاش کے اُس کو برداشت کرتا رہا جب ڈاکٹر گوشت کا اتنا حصہ کاٹ چکا تو مریض نے نہایت اطمینان کی سانس لی" ڈاکٹر نے دریافت کیا "اب تو کوئی درد محسوس نہیں ہوتا"

اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "نہیں" لیکن ذرا سی ٹیس زخم کی ہے، اب تو خون کو آزادی کے ساتھ بہہ جانے دیجئے تاکہ پھر کوئی خلش باقی نہ رہے۔

ڈاکٹر نے زخم پر پٹی باندھی اور مریض نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے ہوٹل کا پتہ بتا کر واپس گیا۔ ڈاکٹر روز وہاں جاتا اور پٹی بدل کر چلا آتا۔ چند دن میں زخم بالکل اچھا ہو گیا اور وہ اپنے وطن چلا گیا۔

(۲)

گزشتہ واقعہ کو تین ہفتہ کا زمانہ گزرا ہوگا کہ وہی شخص پھر واپس آیا اس حال میں کہ اس کا ہاتھ پھر رومال میں لٹکا ہوا تھا اور اسی مقام پر کرب و الم کی وہی شکایت اس کی زبان پر تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور سرد پسینہ اس کی پیشانی پر ٹپک رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھکر اُسنے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے بڑھایا اور بولا کہ معلوم ہوتا ہے آپ نے کافی گہرائی تک چاقو پہونچا کر جراحی نہیں کی اور اسی لئے درد پھر عود کر آیا اور اسی شدت کے ساتھ۔ مہربانی کرکے پھر عمل جراحی کیجئے۔ لیکن مکمل طور پر"

ڈاکٹر نے اس جگہ کو دیکھا جہاں اس کے پہلے عمل جراحی کیا تھا...... پھر کوئی علامت موجود نہ تھی، نئی جلد پیدا ہو کر تمام وریدیں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں نبض بھی اعتدال کے ساتھ چل رہی تھی۔ تپ کی بھی کوئی علامت نہ تھی، لیکن وہ شخص درد کی وجہ سے کانپا جا رہا تھا

ڈاکٹر نے مجبوراً پھر شگاف دیا اور پھر اس کا درد دور ہو گیا۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو ایک حزن وملال کے ساتھ بولا کہ تعجب نہ کرنا اگر میں پھر ایک مہینے کے بعد واپس آؤں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ "آپ یہ خیال دل سے نکال ڈالئے، اللہ نے چاہا تو اب مرض کا اعادہ نہ ہو گا اس نے کہا کہ مجھے تو اس کا ایسا ہی یقین ہے جیسے خدا کے وجود کا، لیکن خیر دیکھا جائیگا۔"

جب وہ ... چلا گیا تو ڈاکٹر نے اس واقعہ کا ذکر اپنے ادر ہم پیشہ احباب سے بھی کیا لیکن کوئی تشخیص نہ کر سکا۔

(۳)

ایک مہینہ گزر گیا اور وہ شخص واپس نہ آیا۔ اس کے بعد بھی کئی ہفتے گزر گئے یہاں تک کہ ڈاکٹر اس واقعہ کو بھول گیا ایک دن اتفاق سے اُسکا ایک خط ملا جس کا مضمون یہ تھا:۔

میرے عزیز دوست۔

میں آپ کو زیادہ عرصہ تک حیرت میں مبتلا رکھنا مناسب نہیں سمجھتا اور اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لیجانا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ درد نے پھر تیسری مرتبہ عود کیا اور میں نے نہایت تیز دہکتا ہوا انگارہ رکھدیا۔ اب میں اس قابل ہوا ہوں کہ ہاتھ کو حرکت دے سکوں اور یہ خط آپ کو لکھتا ہوں

کچھ زمانہ ہوا کہ میں اپنے کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا اور تھا بھی ایسا ہی کیونکہ نشاط زندگی کے لئے جتنے اسباب کی ضرورت ہو وہ سب مہیا تھے۔ میں نے ایک ایسی خاتون سے شادی کی جو حسن وجمال اور سلیقہ وتہذیب کے لحاظ سے عدیم المثال تھی۔ یہاں مجھے بتا دینا چاہئے کہ شادی سے قبل میری بیوی کی دوست ایک اور خاتون بھی تھی جو نہایت ذی عزت اور دولتمند تھی۔

شادی کے بعد چھ مہینے جس لطف ومسرت سے بسر ہوے اس کا بیان محال ہے، ہر نیا دن گویا محبت وخلوص کا ایک نیا دروازہ تھا اور زندگی کا ہر لمحہ ولولہ وشوق کی پر لطف داستان۔ جب میں کسی ضرورت سے شہر جاتا تو واپسی کے وقت وہ دور تک پیدل چلکر میرا خیر مقدم کرتی اور یہ معلوم ہوتا کہ وہ میری روح کے ساتھ جی رہی ہے۔

اسی لطف ومسرت کی زندگی میں دفعتہً یہ خطرہ میرے دل میں پیدا ہوا اور خدا جانے کیوں، کہ اس کی تمام باتیں تکلف وتصنع ہیں۔ میری بیوی کے پاس ایک سینے پرونے کی میز تھی اور اس میز میں ایک خانہ تھا جس کو وہ ہمیشہ مقفل رکھتی۔ نہایت احتیاط سے اس کو بند کرتی اور کنجی اپنے پاس رکھ لیتی۔ اس بات سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ ان میں اس قدر استحکام پیدا ہو گیا کہ مجھے اس کی تمام محبت جھوٹی اور جملہ عنایتیں مکروفریب نظر آنے لگیں، میں بیتاب تھا کہ کسی طرح اس خانہ کو کھول کر دیکھوں کہ اس کے اندر کیا ہے جس کی وہ اس قدر اہتمام کے ساتھ حفاظت کرتی ہے۔

ایک دن وہی خاتون جو میری بیوی کی دوست تھی آئی اور میری بیوی کو اپنے ساتھ لے گئی، مجھ سے بھی اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ بعد دو پہر آؤنگا اُن کے جانے کے بعد میں فوراً میز کے قریب گیا اور کسی نہ کسی طرح اس خانہ کو کھولا جو مقفل رہتا تھا۔ اس کے اندر منجملہ اور اشیاء کے ایک بنڈل بنفشئی رنگ کے ڈورے سے بندھا ہوا ملا۔ میرا دل دیکھتے ہی دھڑکا تھا، لیکن جب میں نے اُسے کھولا تو میرا شک یقین

سے بدل گیا کیونکہ یہ عشقیہ خطوط کا بنڈل تھا۔ میں نے ایک ایک کرکے انھیں پڑھا اور اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا لکھا تھا اور کس طرح انھیں پڑھ رہا تھا، یہ میرے ایک دوست کے خطوط تھے اور اس زمانہ کے تھے جب میری شادی ہو چکی تھی۔ میں نے پھر خانہ کے اندر ان کو رکھا اور قفل لگا دیا۔

جب شام کو میری بیوی واپس آئی تو حسب عادت اسی شوق و ولولہ کے ساتھ ملی جو روز اس سے ظاہر ہوتے تھے میں نے ضبط سے کام لیا اور اسپر اپنے تاثر کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہم دونوں نے ساتھ کھانا کھایا، کھانے کے بعد کچھ وقت حسب معمول باتوں میں صرف کیا اور پھر اپنے اپنے کمرہ میں آرام کی غرض سے چلے گئے میں اس وقت بالکل دیوانہ تھا، دماغ کی یہ حالت تھی جیسے کوئی سیسہ پگھلا کر اندر ڈال رہا ہے۔ جب آدھی رات ہوئی تو میں اُٹھا اور دبے قدموں اس کی مسہری تک پہونچا۔ وہ غافل سو رہی تھی اور اس کے چہرہ سے پورا اطمینان و سکون ظاہر تھا۔ اُس کے چہرہ کے اس سکون کو دیکھ کر میری دیوانگی میں اور اضافہ ہوا اور میں نے اپنا داہنا ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ یہ میری گرفت ایسی آہنی گرفت تھی کہ ایک مرتبہ آنکھ کھول کر مجھے دیکھ تو لیا لیکن اُسنے نہ کوئی آواز نکالی نہ ہاتھ پاؤں مارے، معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت سکون کے ساتھ اس موت کو برداشت کر رہی ہے، تھوڑی دیر میں اُس کا دم نکل گیا۔ اور کوئی علامت ایسی ظاہر نہ ہو سکی جس سے کسی کو قتل کا شبہہ ہو سکتا، البتہ جب گلا دبانے سے اس کا منہ زیادہ کھلا تو اس سے خون کا ایک قطرہ نکل کر میرے داہنے ہاتھ کے اُس حصہ پر پڑ گیا جس سے آپ خوب واقف ہیں۔ لیکن اس کا علم بھی مجھے صبح کو ہوا۔

دوسرے دن جب اسے دفن کرکے میں گھر واپس آیا تو وہی خاتون (جو میری بیوی کی دوست تھی) گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور کلمات تعزیت استعمال کرنے کے بعد بولی کہ "میں اس وقت ایک خاص غرض سے آئی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری مدد کریں گے"۔ میں نے کہا کہ فرمائیے اُس نے جواب دیا کہ "آپ کی بیوی کے پاس میرے کچھ خطوط امانتاً جمع تھے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کیا آپ مجھے واپس دیں گے"۔ میں نہیں بیان کرونگا کہ یہ سنکر میرا کیا حال ہوا، اگر وہ خاتون سامنے نہ ہوتی تو شاید میں چاقو سے اپنے دل کو نکال کر پھینک دیتا، دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دیدیتا۔ بہر حال میں نے حد درجہ صبر و ضبط سے کام لیا اور خطوط کا وہ بنڈل نکال کر میں نے خاتون کے حوالہ کیا۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد ٹھیک اُسی جگہ جہاں قطرۂ خون گرا تھا، جلن محسوس ہوئی اور اس میں رفتہ رفتہ وہ شدت پیدا ہوئی جس کا علم آپ کو بھی ہے۔ بہر حال چونکہ وہ میرے جرم کی سزا ہے اس لئے میں اُسے برداشت کرونگا اور اس کا مداوا نہ چاہوں گا۔ علاوہ اس کے اب یوں بھی کوئی ضرورت اس کے دفع کرنے کی نہ ہوگی۔ کیونکہ میں بہت جلد اس کے پاس پہونچنے والا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ میرے اس قصور کو معاف کردے اور ہم دونوں پھر اسی کھوئی ہوئی محبت کی فضا میں روحانی زندگی بسر کر سکیں"۔

نیاز فتحپوری

ملکہ نرگس بیگم

نظر غور سے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت کچھ فایدہ بخش نتائج نکل سکتے ہیں، فی الحقیقت تذکرۂ رفتگاں ہمارے لئے مرقع عبرت ہے نہ صرف بعض اوقات حیرت وخوشی، اور درد وبیتابی کی ایک مجموعی کیفیت دل پر طاری ہوتی ہے۔ بلکہ یہی اوراق تاریخ نوع انسانی کی بداقبالیوں اور خوش حالیوں، اور امم ماضیہ کے انقلاب آمیز واقعات ہمارے پیش نظر کر دیتے ہیں اور ہم درس عبرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اصول " خذ ما صفا ودع ما کدر " کو پیش نظر رکھکر تجربے حاصل کر سکتے ہیں ؎

ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے — دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

موسیو گسٹو لیبان مصنف تمدن ہند لکھتا ہے۔ " مصنفین اسلام کا ہمیں بہت مشکور ہونا چاہیے کہ اس زمانہ کی تاریخ اسقدر صاف اور واضح ہے جسقدر اس کے ماقبل ازمنہ کی تاریخ تیرہ وتاریک ہے "

یہ ہمارے لئے باعث افتخار ہے کہ ہمارے اسلاف نے واقعات کو کتب تواریخ میں مدون کر کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا تاکہ آیندہ آنیوالی نسلیں بہ غور مطالعہ کریں اور اصلاح عمل کے ساتھ آفتاب تاریخ کی ہدایت کرنے والی نورانی شعاعوں سے استفادہ ...... کریں نہ صرف ہم کو اس سے کاروبار، معاشرت، اور دنیوی معاملات میں مدد ملتی ہے بلکہ دیانت وصداقت، نیک کرداری وحسن تدابیر، شجاعت و دلیری، خلوص وراست بازی کے متحیر کرنے والے واقعات ہماری قوت تخیل میں تحریک پیدا کر کے ہمکو عبرت ونصیحت حاصل کرنے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

فن تاریخ بصیرت انسانی کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور اسکا مطالعہ خیالات میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور جذبات میں تلاطم، انسان کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ وہ دنیا میں پیدا ہو تو ایسے کام کرے جن کی وجہ سے اس کا نام اس کے بعد بھی زندہ رہے اور مشیت ایزدی کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ انسان اس جوہر سے جو خدائے پاک نے اس کی ہستی میں ودیعت کیا ہے کام لے اور نشو ونما کے ساتھ ساتھ محیر العقول کارنامے چھوڑ جائے۔ جب ہم اپنے اسلاف کی زندگی کے حالات پر بالاستعاب نگاہ تنقید ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں سے بعض ایسے گزر چکے ہیں جن کو لوگ قیامت تک یاد کریں گے، اور جن کی برکات یادگاری سوانح ہزاروں برس تک دلوں میں احساس پیدا کرتی رہینگی۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں میں تعلیم اس درجہ عام تھی کہ ادنی سے ادنی پیشے والے بھی اس سے محروم نہ رہتے تھے۔ لیکن تغیر زمانہ کے ساتھ اب مسلمان علم سے اس قدر نا آشنا ہیں، اگر آج کل تعلیم یافتہ خواتین بہت کم نظر آتی ہیں اور تعلیم نسواں کا خیال ایک خواب سا ہے تاہم ازمنہ گزشتہ کی تاریخ اور اس زمانہ کی تصنیفات ہم کو یہ بات بتلاتی ہیں کہ اس زمانہ میں مسلمان عورتوں کی تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی۔ اور تمام بڑے بڑے گھرانوں میں اسکا بخوبی چرچا تھا، خاندانی شرافت کیساتھ یہ جوہر لازمی ہوگیا تھا اور انہیں خواتین نے

ایسے محیر العقول کارنامے چھوڑے ہیں جو ہمارے لئے مواعظ وعبرت کے زریں درس ہیں، شہنشاہ بابر کی بیٹی "شہزادی گلبدن بیگم" نیم تعلیم یافتہ تھی بلکہ اس نے ایک ایسی کارآمد کتاب "ہمایوں نامہ" تصنیف کی جو تاریخی حیثیت سے آج بھی مستند سمجھی جاتی ہے، جہانگیر کی رحلت کے وقت اس کی عزیز بیوی ملکہ نورجہاں بیگم نے جو نظم لکھی سچ تو یہ ہے کہ قابل عورتوں کی لیاقت کا بہترین نمونہ ہے۔ شہزادی زیب النسا کی نکتہ سنجی اور شاعرانہ طبیعت ضرب المثل ہے جو محتاج بیان نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھتے ہیں جو اس امر کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں کہ عورتوں نے انتظام امور مملکت میں بہت حصہ لیا اور اپنے عزیز شوہر کے دوش بدوش امور سلطنت کی انجام دہی میں منہمک رہیں،

آج ہم سرزمین دکن کی عفت مآب، مدبر اور دور اندیش شہزادی نرگس بیگم کے حالات زندگی کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، یہ وہ ملکہ ہے جس کی سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقہ اناث میں بھی بعض بعض بیگمات دلیری، عزم ثبات، جہانبانی، اصابت رائے، اور تدبیر میں مردوں سے کم نہیں رہی ہیں۔

ہمایوں شاہ بہمنی سلاطین بہمنیہ میں نہایت ہی تند مزاج، سفاک اور ظالم وجابر بادشاہ گزرا ہے تخت نشینی سے وفات تک یہ بادشاہ قتل وخونریزی میں مصروف رہا، جس کی وجہ سے تواریخ میں اس کے نام کے ساتھ ظالم کا لفظ لکھا جاتا ہے، رعایائے مملکت اور اراکین دولت اس کی حکومت سے بیزار تھے، جا بجا فتنہ وفساد کی آگ مشتعل تھی، امرا سرکشی [illegible] ظلم وستم سے تنگ آکر درگاہ رب العزت میں دست بدعا تھی کہ جلد اس ظالم وجابر کا خاتمہ ہو جائے اور اس کے پنجہ ظلم سے نجات ملے،

ملکہ مخدومہ جہاں نرگس بیگم اسی بادشاہ کی بیوی تھی جو آج تک ظالم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے لیکن ایسے نانا کی نواسی تھی جس کا ثانی خاندان بہمنیہ میں نہیں گزرا یعنی فیروز شاہ بہمنی جو شوکت وعظمت میں اور شاہان بہمنیہ پر امتیاز تمام رکھتا ہے، ایسے پرآشوب زمانہ میں جب کہ تمام سلطنت میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ارکان سلطنت خودسر تھے، اور رعایا بددل تھی، ہمایوں شاہ نے ۸۶۵ھ میں انتقال کیا، اور عنان حکومت نرگس بیگم کے ہاتھ میں آئی گو ایسے پرخطر زمانہ میں جب کہ قواعد وضوابط شمسی کا دیباچہ الٹ چکا تھا صنف لطیف کی ایک نازک ہستی کا ایک کمسن بچہ کے لئے انتظام مملکت کو اپنے ہاتھ میں لینا یقینی بادی النظر میں حیرت ناک اور تعجب خیز نظر آئے گا، لیکن ملکہ نے جو علاوہ عظمت خاندانی اور لیاقت ذاتی کے عقل وتدبر، شجاعت وہمت، سخاوت وفیاضی، قدردانی اور کمال پروری کے جواہرات سے مزین تھی تمام ملکی معاملات میں حصہ لیا اور اپنی دور اندیشی وحسن تدبیر سے بتدریج تمام بغاوتوں کا خاتمہ، بدعنوانیوں کا انسداد اور فتنہ وفساد کی آگ کو فرو کر دیا، ملک میں امن وعافیت قائم ہوئی اور رعایا خوشحال ہو گئی،

جب ہمایوں شاہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے شہزادہ نظام شاہ ہشت سالہ کو ولیعہد مقرر کیا اور خواجہ جہاں ترک کو وکیل السلطنت اور خواجہ محمود گاواں ملک التجار کو وزیر قرار دیکر وصیت کی کہ ملکہ مخدومہ جہاں معہ اتفاق وزرا ریاست کا انتظام کرے، چند ہی دن کے بعد ہمایوں شاہ کا انتقال ہو گیا اور حسب دستور سلاطین بہمنیہ فاتحہ سوم کے بعد دربار عام منعقد ہوا اور قاعدہ کے سادات عظام سے دو شخص محب اللہ اور سید شریف نے تیمناً وتبرکاً دائیں وبائیں جانب سے نظام شاہ کو سہارا دیکر تخت فیروزہ پر بٹھایا

نرگس بیگم نہایت عاقل و زیرک تھی، علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ تھی، ملک کے انتظام و اہتمام کا ملکہ بھی رکھتی تھی، حسب وصیت معاملات ملکی و مالی سے مزید واقفیت حاصل کرکے خواجہ جہاں ترک اور خواجہ محمود گاواں جیسے تجربہ کار و کار آزمودہ مشیروں کو وزارت اور وکالت کے عہدوں پر مامور کیا، حسن اتفاق سے یہ دو ایسے عدیم النظیر کارپرداز مل گئے جو بہی خواہ سلطنت تھے اور جنہوں نے اپنی شجاعت و ہمت تدبر و پختہ کاری سے سلطنت کی بقا میں بہت سعی و کوشش کی ملکہ کو ان پر بےحد اعتماد تھا تمام امور و مہمات شاہی ان دونوں کی صلاح و مشورہ سے انجام پاتے تھے، ہر روز علی الصباح یہ دونوں باتفاق دربار میں آتے تھے اور عرض اخلاص بجا لاکر ایک عورت ماہ بانو کے ذریعہ تمام امور کے متعلق احکام حاصل کرتے تھے، جو کچھ ملکہ کے احکام صادر ہوتے تھے بلا کم و بیش ان کی تعمیل کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں کے حسن اہتمام سے کاروبار سلطنت بوجہ احسن انجام پائے اور سلطنت کو استقلال حاصل ہوا

جب گرد و نواح کے سلاطین نے سنا کہ تخت بہمنیہ پر ایک خورد سال بچہ بیٹھا ہے، اور عنان حکومت ایک عورت کے ہاتھ میں ہے تو انھوں نے اپنی دیرینہ خواہش کو پورا کرنے اور سلطنت بہمنیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے اس کو زرین موقعہ خیال کیا، اور ایک دم ہر طرف سے اسیر حریص جانور کی طرح ٹوٹ پڑے، اس کی تباہی کے لئے شاطرانہ چالوں اور سیاسی حربوں سے کام لیا، تاریخ شاہد ہے کہ سلطنت بہمنیہ کے لئے یہ نہایت نازک وقت تھا، فی الواقعی اگر مخدومہ جہاں کا تدبر اور خواجہ جہاں و خواجہ محمود گاواں کی بہادرانہ دسرفروشانہ کارگذاریاں نظام شاہ کے شامل حال نہ ہوتیں تو دکن کی یہ عظیم الشان سلطنت ہمسایہ طاقتور حکومتوں کا شکار ہوگئی ہوتی،

ایک کمسن بچہ کے تخت نشین ہونے سے سب سے زیادہ تحریص و ترغیب اڑیسہ اور اودیا کے راجاؤں کو ہوئی اور اس موقعہ کو غنیمت جانکر متفقہ طور پر حملہ آور ہوئے، لیکن مخدومہ جہاں پریشاں ہونے والی یا ہمت ہارنے والی عورت نہ تھی۔ اس نے نہایت استقلال کیساتھ مدافعت کے لئے تیاری کی، اور چالیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئی اور اس عمدگی کیساتھ فوج کی سپہ سالاری کی کہ دشمن کو شکست فاش دیکر مظفر و منصور واپس آئی،

ابھی اس مصیبت سے نجات حاصل نہ ہوئی تھی کہ سلطان محمود خلجی والی مالوہ بھی ایک جرار فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، ادہر سے بھی مقابلہ کے لئے فوج روانہ کی گئی، قندہار کے پاس معرکہ کارن پڑا، اس زور و غضب کے ساتھ لڑائی ہوئی کہ نعروں کے گونج سے زمین دہل پڑ گئی دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا، مگر کسی نے بھی قدم پیچھے ہٹانے کا نام نہ لیا، دونوں طرف کے نبرد آزماؤں نے اپنی بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے، ایک وقت تو ایسا آیا کہ بہمنیہ فوج کامیاب نظر آنے لگی، خلجیوں کی فوج میں ہراسانی و پریشانی نے اپنا تسلط جما لیا تھا، محمود خود میدان جنگ سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مصاحبین نے اس کو اس حرکت سے روکا، اور استقلال و ہمت سے کام لینے کا مشورہ دیا پھر کیا تھا آن کی آن میں قسمت کا پانسہ پلٹا، یا تو فتح ہو رہی تھی یا اب جان کے لالے پڑ گئے، خود نظام شاہ بھی دشمنوں کی زد پر تھا، سکندر خاں نے حق نمک ادا کیا۔ نہایت دلیری کے ساتھ میدان جنگ سے اپنے آقا کو بچالایا، آخرکار اس لڑائی میں محمود خلجی کو فتح حاصل ہوئی، اس کامیابی نے حرص و آز میں اور اضافہ کردیا، برار اور بیٹر پر قابض ہوکر اپنے پاؤں پھیلائے، بیدر کی طرف رخ کیا سلطنت کو بالکل تباہ کرنے کی دل میں ٹھان لی۔ لیکن ملکہ مخدومہ جہاں اس کی ان جارحانہ کارروائیوں سے غافل نہ تھی وہ اندر ہی اندر

اس کے مقابلہ کی تدبیریں سوچ رہی تھی، آخر کار اس نے طے کیا کہ باہر سے امداد حاصل کیجائے چنانچہ اُس نے فوجی امداد کے لئے محمود شاہ گجراتی کو خط لکھنے کے لئے محمود گاواں کو ہدایت کی، محمود شاہ اسی ہزار سوار لیکر مدد کے لئے روانہ ہوا، گجراتی اور دکھنی فوج نے بالآخر محمود خلجی کو کامل شکست دی وہ بحالت تباہ، تمام ساز و سامان اور اسباب شاہی چھوڑ جان بچاکر بھاگ گیا،

شاہان بہمنیہ کا یہ دستور تھا کہ بیاہی بیوی کو ملکہ مخدومہ جہاں کا خطاب دیا کرتے تھے، اور یہی ملکہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے عموماً اس بات کی پابندی کی جاتی تھی کہ پہلی بیوی خاندان شاہی سے ہو، رواج کے مطابق ملکہ نرگس بیگم نے بھی نظام شاہ کی شادی اپنے ہی خاندان کی ایک شہزادی سے کی اور جشن شاہانہ ترتیب دیا اسی شب کو جب کہ مجلس زفاف آراستہ ہوئی، بزم عیش و عشرت کی ترتیب پانے سے ایک دنیا... شادی و خرمی میں مشغول ہوئی۔ خدا جانے کیا بلائے ناگہانی نازل ہوئی کہ آدھی رات کے بعد محل شاہی میں نالہ وزاری سے شور بپا ہوا اور یہ خبر وحشتناک سننے میں آئی کہ نظام شاہ نے اس جہاں سے رحلت کی "۸۶۶ھ" نوحہ و ماتم سے قیامت کا نقشہ کھنچ گیا عشرتکدہ ماتم کدہ بنگیا، اگرچہ مخدومہ جہاں کا دل کثرت رنج و غم سے پارہ پارہ ہو رہا تھا لیکن اس نے نہایت استقلال سے کام لیا۔ آہ ایسی شفیق ماں کو کس قدر رنج ہوا ہوگا، جس نے اس کمسن بچہ کو اپنی آغوش محبت میں چھپائے، صبر و استقلال سے اس کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے سلطنت کے امور نہایت عمدگی سے انجام دے جبکہ افق سلطنت بہمنیہ پر مخالفت و دشمنی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور شوہر کے ظالمانہ طرز عمل سے رعایا نالاں اور امرا بددل تھے ملکہ نے جس جگر گوشہ کے لئے ان تمام کانٹوں کو دور کیا، اور راہ کو ہموار کیا، فتنہ و فساد کی وجہ سے جو خرابیاں پڑ گئیں تھیں ان کو رفع کیا، وہی نور نظر عالم جوانی میں اور عین شب عروسی میں داغ مفارقت دے گیا، یہ سب کچھ تھا مگر اس دلیر اور باہمت خاتون نے مستقل مزاجی سے کام لیا، اور دامن صبر و شکیب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بلکہ سب سے پہلے اسکی تجہیز و تکفین کی فکر کی۔ پھر جب دستور فاتحہ سیوم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دوسرے کمسن فرزند محمد شاہ کو تخت نشین کیا،

ملکہ نے محمد شاہ کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ کی، وہ خود تعلیم یافتہ تھی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ تاج و تخت کے مالک کی تعلیم و تربیت میں غفلت و لاپروائی کرتی - اس نے ایک فاضل ہستی کو اس عہدے کے لئے منتخب کیا یعنی شوستری جیسے عالم کو اس کا اتالیق مقرر کیا شوستری نے بادشاہ کو بہترین طریقہ پر تعلیم دی۔ خود شاہزادہ نہایت ذکی و ذہین تھا اسپر مخدومہ جہاں کی نگرانی اور شوستری کی تربیت نے سونے میں سہاگے کا کام کیا، یہ بادشاہ ایسا لائق و عالم نکلا کہ خاندان بہمنیہ میں فیروز شاہ کے بعد اس سے بہتر اور کوئی نہیں گزرا -

ملکہ مخدومہ جہاں کے زمانہ میں ایک ایسا اہم واقعہ گزرا ہے جس کا یہاں تذکرہ نہ کرنا اظہار حق سے گریز کرنا ہے، اسی واقعہ کو بعض تاریخ نویسوں نے نہایت آب و تاب کے ساتھ ظاہر کر کے سختی کے ساتھ ملکہ کی طرز عمل پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور اس کو محسن کش و احسان فراموش قرار دیا ہے لیکن اگر اطمینان کے ساتھ سیاسی پہلو پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعات و حالات کا لحاظ کرتے ہوئے مجبوراً ملکہ کو اس طرح کرنا پڑا، وہ الزام جو ملکہ پر عاید کیا جاتا ہے کہ وہ خواجہ جہاں ترک کے قتل کا باعث ہوئی، اور ایک وفادار اور جانثار سلطنت کی خدمت کا عوض اس طرح دیا۔ اب ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ واقعات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات ثابت ہو جائے

کہ اس طرح کا سلوک کرنے میں ملکہ حق بجانب تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ جہاں نے گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا، سلطنت کے استحکام میں کوشش کی اور ابتدا میں اچھا بندوبست کیا مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس سے بے اعتدالیاں اور حماقتیں سرزد ہونے لگیں، خود کو سلطنت کا مختار کل سمجھکر حکومت جتانے لگا یہانتک کہ کسی کو خیال میں نہ لاتا تھا، ناعاقبت اندیشی سے محل والوں کی تنخواہیں روکدیں، اور امرا قدیم کی جاگیریں چھین کر اپنے آوردوں کو دینا شروع کیا اور بعض اپنے طرفداروں کو بڑے بڑے عہدے بھی دئے چونکہ بہت سی مہمات میں شریک ہوکر، دلیری اور بہادری دکھاکر خاص افتخار حاصل کرچکا تھا اس واسطے اپنی قوت و اقتدار پر بہت زیادہ گھمنڈ ہوگیا، نشۂ غرور سے سرشار ہوکر دست تغلب و تصرف شاہی خزانوں پر دراز کیا، ملک التجار محمود گاواں کو مدمقابل سمجھکر ہمیشہ اس کو سرحدی خدمتوں پر بھیجا کرتا تھا تاکہ وہ مرکز حکومت سے دور رہے اور اس کو اپنی خواہشات کے پورا کرنے کا موقعہ ملے۔

ملکہ مخدومہ جہاں، محمود خلجی کے واقعہ کے زمانہ ہی سے بدظن ہوگئی تھی۔ اس واسطے کہ اس نے سکندر خاں کو اس جرم میں کہ وہ نظام شاہ کو معرکہ کارزار سے نکال لایا تھا۔ قید کردیا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ خواجہ جہاں کا یہ خیال تھا کہ بادشاہ کے میدان جنگ سے ہٹتے ہی سپاہیوں میں بددلی پھیل گئی جس کی وجہ سے شکست ہوئی، ایک لحاظ سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس واسطے کہ مشرق میں بادشاہ ظل اللہ سمجھا جاتا ہے اور مشرق بادشاہ پرستی کے لئے مشہور ہے، جب تک وہ نظروں کے سامنے ہے اہل مشرق کو بیحد تقویت حاصل ہوتی ہے بہرحال خواجہ جہاں کی نیت کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کی طرز عمل سے ملکہ مشکوک ہوچکی تھی۔

ایشیائی درباروں میں یہ بات اکثر مشاہدہ میں آتی ہے کہ جو امیر بادشاہ کے جلوس سلطنت میں سعی بلیغ کرکے فروغ پاتا ہے اسکی خواہش طبعی یہ ہوتی ہے کہ جملہ مقدمات جزئی وکلی میں بادشاہ پر تسلط و اقتدار حاصل ہو، لیکن فطرت انسانی سے مجبور سلاطین بھی ایسے امیر کی خواہش بیجا کو ناپسند اور تسلط کو گوارہ نہیں کرتے، جسکا نتیجہ خانہ جنگی اور ان میں سے کسی ایک کا استیصال ہوتا ہے۔

دور اندیش وذی عقل ملکہ نے جب یہ دیکھا کہ خواجہ جہاں روز بروز اپنی قوت بڑہا رہا ہے تو وہ اس کے اوضاع و اطوار سے بیحد متاثر ہوئی اور اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں موقعہ پاکر نمک حرامی نہ کرے، اس لئے اس اولوالعزم ملکہ نے سمجھ لیا کہ خواجہ کا وجود سلطنت بہمنیہ کے حق میں مضر ہے اور جلد اُس کا انسداد ہونا چاہئے اس کی مفسدی و کورنمکی کو محمد شاہ کے ذہن نشین کراکے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ جلد خواجہ کو تیغ بیدریغ کرکے سلطنت کو اس کے شر سے محفوظ رکھے ۸۶۷ھ کا واقعہ ہے کہ ایک دن حسب معمول خواجہ دربار میں آیا، مگر خلاف عادت نظام الملک کو سپاہیوں کی ایک جماعت کے ساتھ دیکھکر متعجب و متفکر ہوا، لیکن دربار سے بغیر کورنش کئے نکلنا مشکل تھا۔ بہ امر مجبوری ولاچاری معمولی امور میں مشغول ہوا، اسی اثنا میں دو ضعیف عورتیں محلسرا سے برآمد ہوئیں اور سلطان سے عرض پرداز ہوئیں کہ جو کام قرار دیا گیا ہے وہ جلد طے پائے، یہ سنتے ہی سلطان نے نظام الملک کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ فوراً قتل کردو۔ نظام الملک جو اس کا دشمن تھا بادشاہ کے حکم ہی کا منتظر تھا بے تامل اس کا ہاتھ پکڑکر دربار سے باہر لے گیا اور تلوار کو میان سے نکال کر اپنے ہی ہاتھ سے کام تمام کردیا، ایک ایسے شخص کا قتل کرنا جس نے سلطنت میں اپنا رعب اور خاص اقتدار قائم کرلیا تھا

کوئی آسان کام نہ تھا مگر ملکہ نے حسن تدبیر اور دانائی سے اس معاملہ کو اس عمدگی سے انجام دیا کہ کوئی فتنہ و فساد بپا نہ ہوا۔

بہ تدبیر زاں پس خردمند زن   بہ فرمان خود ساخت ملک دکن
جہانے ز عدلش بہ آسودگی   ....

شخصی حکومتوں میں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس طرح بعض امراجب زیادہ مقتدر ہو جاتے تھے تو ان کا وجود سلطنت کی بقا اور بادشاہ کی سلامتی کے لئے مضر ہو جاتا تھا، عام طور پر شخصی سلطنتوں کے اختیارات اور ان کی مجبوریوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ سیاست ملکی اس قسم کے سلوک کی متقاضی ہوتی ہے اسواسطے کہ ہر ایک سلطنت میں شخصی ہو یا جمہوری یہ نہایت مشکل ہے کہ ایک شخص نیک نام ہو کر زندگی بسر کرے، کچھ لوگ اس کے زیادہ بارسوخ ہونیکی وجہ سے اس کے مخالف اور دشمن ہو جاتے ہیں اور پھر بادشاہ کا غیظ و غضب اس کے روز افزوں اقتدار کو دیکھکر ترقی کر جاتا ہے، اسیطرح کی ایک مثال جعفر برمکی کی ہے۔ خاندان برمکی سے جو فائدہ خاندان بنو عباس کو پہونچا وہ محتاج بیان نہیں، تاہم انتظام مملکت اور سیاست ملکی کی خاطر ہارون رشید نے وہ کام کیا جو اس کے شایان شان نہ تھا اور جو مستحن نہیں سمجھا جا سکتا یعنی قتل برمکی جس کی وجہ سے وہ محسن کش اور احسان فراموش مشہور ہوا۔ یہاں امام المورخین علامہ ابن خلدون کی رائے کا درج کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

"برامکہ پورے طور پر دولت عباسیہ پر قابض ہو گئے تھے، یہاں تک کہ وقت ضرورت ہارون الرشید کو تھوڑا سا روپیہ بھی خزانہ سے نہیں مل سکتا تھا۔ برامکہ کا قدم، استقلال و استحکام کیساتھ سلطنت میں جم گیا تھا۔ اور وہ حکومت پر غالب تھے رشید کو سلطنت میں دخل و تصرف کا کچھ بھی اختیار باقی نہ تھا اور تمام دنیا میں آہستہ آہستہ ان کی شہرت پھیل گئی تھی اور سلطنت کے تمام اعلیٰ درجہ کے منصب انھوں نے حاصل کر لئے تھے"

ان مذکورۂ بالا واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم خواجہ جہاں کے طرز عمل پر نظر ڈالیں تو ہمکو ان دونوں میں تطابق عظیم نظر آتا ہے۔ لہذا ان پر غور کرتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی طرح بھی ملکہ نرگس بیگم کا طرز عمل قابل اعتراض نہیں، اور نہ اس کی وجہ سے اس کے حالات زندگی میں کوئی تاریک پہلو پایا جاتا ہے،

ملکہ مخدومہ جہاں، محمد شاہ کے ایام بلوغ تک نیابتاً انتظام کرتی رہی، جب اُس نے عالم شباب میں قدم رکھا تو ملکہ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی بہت جلد ملکہ اس فرض سے سبکدوش ہو گئی، خاندان شاہی کی ایک حسین، زہرہ جبین شہزادی کیساتھ نہایت تزک و احتشام سے شادی کا اہتمام کیا، اور تمام مہمات سلطنت کا انتظام فرزند دلبند کے سپرد کر کے گوشہ نشینی اختیار کی اور بقیہ عمر صوم و صلوٰۃ اور تلاوت قرآن مجید و فرقان حمید میں صرف کی،

گو محمد شاہ کلیتہً بادشاہ تسلیم کر لیا گیا تاہم وہ ہمیشہ اہم امور میں ملکہ سے مشورہ لیا کرتا تھا، اور اس قسم کے معاملات ملکہ کی دانائی و عقل کی رسائی اور حسن تقریر کی وکالت سے سلجھتے تھے چونکہ سعادتمند فرزند اپنی والدہ کی حقیقی خوبیوں سے واقف تھا، وہ ملکہ کی بیحد تعظیم و تکریم کرتا تھا، بلاناغہ روزانہ سلام کے لئے حاضر خدمت ہوا کرتا تھا۔

حسن وجمال میں بھی ملکہ کا کوئی ثانی نہ تھا، حسن صورت کی طرح حسن سیرت میں بھی وہ اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی، وہ ایک بے نظیر وبے عدیل حسین وجمیل خاتون تھی جو کمالات علمی وانتظامات ملکی میں بیحد دخل رکھتی تھی، اس کے علمی ذوق کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کی ڈیوڑھی پر بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں نہ فلسفیوں اور شاعروں، ریاضی دانوں اور مہندسوں، فصیحوں اور ادیبوں کا مجمع رہا کرتا تھا، ملک دکن میں اہل علم وصاحبان کمال کا مرجع وماویٰ اسی کا گھر تھا، اس کے مردانے مکان سے بڑی علمی صحبت ملک بھر میں کہیں نہ تھی اہل کمال کی جیسی وہ قدر کرتی تھی اس کا اور اس کے علمی شوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے دربار میں ہمیشہ منتخب روزگار کا مجمع رہا کرتا تھا، اور اس کے سلوک کی وجہ سے بڑے بڑے امراجان نثاران سلطنت بن گئے اور خیر خواہی میں جان دینا معمولی بات سمجھتے تھے۔

مہمات سلطنت کو انجام دینے کے علاوہ ملک میں ضبط وانتظام رکھنے اور انصاف وعدل کیساتھ معاملات طے کرنے میں بھی وہ شہرت حاصل کی کہ لوگوں نے نوشیرواں کے عدل وانصاف کو بھلا دیا اور وہ قصے داستان پارینہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے، گو کہنے کو تو وہ صنف لطیف کی ایک نازک ہستی تھی لیکن اس میں ملک گیری وکشورستانی کا جذبہ موجود تھا، نیز اس نے کفر کے رفع کرنے میں بہت سعی وکوشش کی، گنجی و کالستری جیسے مقامات اس کے قبضہ تصرف میں آ گئے، ہر روز فتح وکامیابی اسے حاصل ہوتی گئی، اور اقبال وطالعمندی نے کامرانی کے پھول اس کے قدموں پر نچھاور کئے،

اس کا فیض عام، امیر وغریب برنا وپیر کافر ومسلمان خورد وبزرگ سب کو یکساں مستفید کرتا تھا، اس کی سخاوت نے لوگوں کے دلوں سے حاتم کی سخاوت کی داستان کو فراموش کرا دیا، نیک کاموں میں سب سے پیش پیش رہتی تھی کوئی شخص اس کے در سے بے نیل مرام واپس نہ ہوتا تھا اس نے سرائے اور مسجدیں تیار کرائیں، جابجا سڑکوں پر باؤلیاں بنوائیں تاکہ مسافر سفر کرنے میں تشنگی آب سے جاں بلب نہ ہو جائیں، ملکہ بیحد رحمدل تھی، مظلوم وستم رسیدہ کی دستگیری واعانت کرتی تھی بڑی عالی دماغ ولائق تھی۔ امور مملکت کی واقفیت اور سیاست دانی کے لحاظ سے اس کا مرتبہ ہند کی مستورات میں بہت بلند ہے، بہادری ودلیری میں ایسی ہی مشہور تھی جیسا کہ چاند بی بی احمد نگری ہمت وجرأت میں، جب تک زندہ رہی مہمات سلطنت کو حسن وخوبی اپنے دونوں معتمدین کی مدد سے انجام دیتی رہی ملکہ کے عہد میں تمام رعایا خوشحال اور فارغ البال تھی، ظلم وستم، جبر وتشدد کا نام ونشان نہ تھا، ہمایوں شاہ کے وقت میں جتنی سختیاں کیگئی تھیں اسی قدر ملکہ نے عمدہ سلوک کیا، اور رعایا کی فلاح وبہبود میں ہمہ تن منہمک رہی، سچ تو یہ ہے کہ ملکہ نے اپنے شوہر کی بدنامی کو نیک نامی سے تبدیل کرکے اس کی بہت کچھ تلافی کر دی، اور فی الحقیقت ہمایوں شاہ کے ظلم وستم کو لوگ بھول گئے۔

جب بلگواں کے راجہ کی سرکشی کی خبر سنکر اس کی تادیب کے لئے محمد شاہ روانہ ہوا تو ملکہ مخدومہ جہاں بھی اس کے ہمراہ گئی اور اپنے زریں مشوروں سے اس کو ہدایت کرتی رہی، آخرکار ملکہ کی نیک صلاح پر عمل کرنے سے فتح حاصل ہوئی اور راجہ پابزنجیر دربار شاہی میں حاضر ہو کر عذر تقصیر کا خواستگار ہوا، کامیابی کے ساتھ اس مہم کو سر کرکے جب محمد شاہ واپس ہو رہا تھا اور ابھی دار السلطنت تک پہونچا بھی نہ تھا کہ راستہ میں ملکہ سخت بیمار ہوگئی، اطبا وحکما نے معالجہ میں بیحد کوشش کی لیکن چونکہ پیمانہ عمر لبریز ہو چکا تھا، سعی وکوشش مفید ثابت نہ ہوئی، راستہ ہی میں ملکہ نے عالم فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا، محمد شاہ کو ایسی شفیق ومہربان والدہ کے انتقال کا بیحد

رنج ہوا، لاش کو دفن کرنے کے لئے شاہانہ تزک و احتشام سے دارالسلطنت بیدر کی طرف روانہ کیا، اور بادشاہ کے حسب الحکم سلاطین بہمنیہ کے مقبرہ میں سپردِ گور کردی گئی،

حقیقت میں ملکہ بڑی عالی ہمت تھی، اس ملکہ کی حسن تدبیر سے سلطنت بہمنیہ کو محمد شاہ کے زمانہ میں عروج حاصل ہوا، اور وسعت ملک میں بیحد اضافہ ہوا، رعایا خوشحال تھی، شاہی خزانہ زروجواہر سے معمور تھا، اس ملکہ کی دوراندیشی اور عنایات شاہانہ نے خواجہ محمود گاواں کو ملک کا خیرخواہ بنایا۔

محمد شاہ نے حکم دیا کہ ایسی عالی ہمت اور منصف مزاج اور لائق روزگار ملکہ کا گنبد مزار بھی مستحکم سنگین اور عالیشان بنایا جائے چنا[نچہ] اسیطرح حکم کی تعمیل کی گئی اور ملکہ کا مزار باوجود حوادث روزگار اور انقلاب زمانہ کے اب تک باقی ہے، اور یہ آثار صنادید عہد ما[ضی] کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

کسی شاعر نے ہردل عزیز ملکہ کی تاریخ وفات عربی میں کہی تھی جسے ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

درۃ التاج مریم الاتار — اذ جارت ندا ربا عشہا
ملہم الغیب قال فی التاریخ — ابد الله ملک وارثہا

ماخذ:۔ (۱) تاریخ فرشتہ (۲) تحفۃ الملوک (۳) چمن گلشن (۴) تاریخ سلاطین دکن (۵) محبوب الوطن تذکرۂ سلاطین دکن (۶

فلسفۂ مذہب

(بہ سلسلۂ ماسبق)

اب ہم آنحضرت کی اس خالص نبوت کی زندگی پر جو آپ نے مکہ میں گزاری ہے نظر ڈالتے ہوئے نبوت کے اوصاف کا ایک معیار قائم کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

اول اس شخص کا اخلاق اس قدر بلند ہو کہ دوست و دشمن سب اسپر اعتبار کریں وہ شخص کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو، نہ اس نے کسی امانت میں خیانت کی ہو۔

دوم۔ وہ ایسا موثر کلام کہے جسکے مثل لوگ نہ کر سکتے ہوں اگرچہ وہ کوشش بھی کریں۔

سوم۔ وہ باوجود امی ہونے کے ایسی باتوں کی خبر دے جس کی تصدیق دوسرے ذرائع سے ہو سکے۔

چہارم۔ اس کے کلام میں فحش و لاطایل باتیں نہ ہوں۔

پنجم۔ اس کا مقصد اپنی بڑائی اور عظمت کے بجائے دوسروں کی بھلائی ہو۔

ششم۔ وہ لوگوں کو ایسے کاموں کی طرف بلائے جن کو عقل سلیم خود بخود مان لے۔

پس یہ شرائط اگر ایک نبی میں پائے جاتے ہیں تو عام اس سے کہ اس نے متعدد شادیاں کی ہوں۔ جہاد کیا ہو۔ کھاتا پیتا ہو یا بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، ہم اسکو نبی ماننے کے لئے تیار ہیں اور اس کا کلام یقیناً الہامی ہوگا کیونکہ بغیر اس کے کلام کو الہامی مانے ہوئے نہ ہم اسکے قول پر اعتبار کر سکتے ہیں اور نہ اس کے احکام کی تعمیل پر دل سے مجبور ہو سکتے ہیں۔ لہذا مذہب کے لئے نبوت و کلام الہامی لازم ملزوم ہے۔ اور یہ صورت تقریباً ہر ملک و قوم میں پیش آئی ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں جو اختلاف رونما ہے وہ یا تو نبوت کی باتوں پر متوجہ نہ ہونے یا نہ سمجھنے یا ان کو فراموش کر دینے کی وجہ سے ہے۔

مذہب کے اصول یعنی خداشناسی۔ تکوین و حشر۔ سزا و جزا۔ ایسی باتیں ہیں جن میں انسانی عقل بہت کم رہبری کر سکتی ہے۔ اور جب کبھی انسانی عقل نے مذہب بنایا ہے وہ وحشیوں کے خودرو مذہب سے بہت کم فرق رکھتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ اگر مذہب فطری چیز نہیں ہے بلکہ اکتسابی ہے تو کیا انسان بلا مذہب کے ہی دنیا میں رہ سکتا ہے۔ یہ سوال معمولی نہیں ہے جبکہ مہذب دنیا کے لوگ بہ بانگ دہل اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ مہذب ترین قوم کے افراد ہیں اور کسی مذہب سے سروکار نہیں رکھتے پھر اگر ایک طرف یہ صدا ئے بے ہنگام ہے تو دوسری طرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فلسفی و نکتہ داں اپنے قومی مذاہب میں سخت نہماک رکھتے ہوئے پائے گئے۔ اور ایسی باتیں انھوں نے کیں اور کہیں کہ مشکل سے عقل سلیم ان پر یقین کر سکتی ہے۔ سقراط کی فراست میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن سقراط مرتے وقت اپنے شاگردوں کو وصیت کر جاتا ہے کہ اس کے ذمہ فلاں دیوتا کی مرغ کی قربانی

باقی رہ گئی ہے وہ پوری کیجائے۔ مذہب کا یہ کرشمہ درحقیقت نہایت تعجب انگیز ہے خود ہمارے ہم وطن ہی کیسے کیسے عالم و فلسفی ہیں مگر مذہب کے اعتقاد میں وہ اور ایک دہقانی جو ایک گول پتھر پر صبح جل چڑھاتا ہے برابر ہیں۔ یہ عقدہ غالباً کبھی حل نہ ہوگا کہ وہ سارے خرافات جو توحید کے خلاف دنیا کی متعدد قوموں میں کثرت سے معمول بہ ہیں ان کو ان کے ماننے والے خود ہی لغو سمجھتے ہیں۔ لیکن سوسائٹی کے ڈر سے زبان نہیں کھول سکتے یا درحقیقت وہ اس کو ویسا ہی سنجیدگی سے باور کرتے ہیں جیسا کہ ایک نادان شخص باور کرتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مذہب کی تاریخ میں اسلام سے قبل صرف یہود بنی اسرائیل میں دیوتاؤں کے خلاف ایک خدائے واحد کے وجود کا خیال پایا جاتا ہے۔ ورنہ کیا کلدانی۔ کیا مصری۔ کیا رومی۔ کیا یونانی سب مذاہب میں وہی باتیں ہیں جو انسان نے خود اپنے دل سے پیدا کرلیں اور جو بیشمار دیوتاؤں کی پرستش پر مبنی ہیں۔ کم سے کم یہ یورپ کی تحقیق ہے۔ ممکن ہے کہ ان کو دنیا کے کسی مذہب میں خدا کا وجود نہ ملے کیونکہ انھوں نے یہ کلیہ پہلے سے بنا لیا ہے کہ صرف بنی اسرائیل ہی کو خدا شناسی کا پتہ حاصل تھا۔ مگر قرآن ہر قوم میں نبوت کو تسلیم کرتا ہے۔ پس ان نبیوں کی تعلیم کہاں گم ہوگئی۔ ضرور ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ اوہام انسانی میں نبوت کی باتیں گم ہیں اور انکی تلاش سے ہم کو بہت کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ رومیوں اور یونانیوں کے بارے میں تو پتہ نہیں چلسکتا کیونکہ مسیحیت نے خود غرضی سے انکی اصل کو دنیا سے مفقود کردیا تاکہ مسیحیت کا ستارہ تاریکی میں زیادہ روشن نظر آئے۔ مگر مشرق کے مذاہب میں نبوت کے خیالات ضرور ملتے ہیں۔ چنانچہ قدیم مصریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فرعون (اسوقیس چہارم) نے یہاں تک کوشش کی کہ اپنے پرانے معبودوں اور اس پائے تخت کو چھوڑ کر جو معبد مواں یا ماں۔ تامے اور دی کی سرپرستی میں بنایا گیا تھا، تل العمرانہ کے قریب ایک نیا پایۂ تخت اپنے نئے اور تنہا خدا آتون کے نام سے بنوایا اور خود اپنا لقب انی ناتوں (یعنی آتون کا پرتو نور) رکھا۔ اس نئے معبود کے متعلق کتاب تعلیمات میں جو مناجات کی صورت میں قدیم مصریوں کے قول کے مطابق الہامی بتائی جاتی ہے۔ توحید الہیات کے وہ خیال پائے جاتے ہیں جنکو ہم واقعی الہامی کہسکتے ہیں۔ لیکن انناتون کے مرنے کے ساٹھ سال کے اندر قدیم بت پرستی کے خیالات نے پھر پلٹا کھایا اور نئے خیالات جو ایک خدا کی پرستش پر مبنی تھے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اعظاتین خاندان کے سلاطین جن کے زمانے میں مصریوں میں توحید کا رواج تھا ٹھیک وہی زمانہ تھا جب حضرت یوسف مصر میں تھے تو گویا تاریخی کتبے اور قرآن مجید دونوں اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت یوسف درحقیقت مصر کے مسلم مبعوث پیغمبر تھے۔ اور ان کی تعلیم سے مصریوں کے خیالات بدلے۔ اسیطرح قدیم کلدانیوں میں حمورابی کے زمانے کے بعد سے جبکہ بابل کی سلطنت و مذہب کی تشکیل ہوئی۔ بعل کے لئے وہی صفات مانے جاتے تھے جو ایک خدا میں سمجھے جاسکتے ہیں، اور وہاں بھی کتبات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت نوح کی تعلیم ایک عرصہ تک ان میں کام آئی رہی تا آنکہ انھوں نے بودہ مذہب و عیسائی مذہب کی طرح خود حضرت نوح کو اتونام کا ایک دیوتا بنا لیا۔ ہندوؤں کے مذہب میں بھی بقول البیرونی عوام سے بالاتر ایک طبقہ تھا جنکا خیال خدا کی نسبت بالکل الہامی کہا جا سکتا ہے۔ وہ خدا کو واحد ازلی۔ قادر مطلق خالق کائنات وغیرہ وغیرہ صفات کے ساتھ ویسا ہی مانتے تھے جیسا ہم مسلمان۔ چنانچہ کتاب پاتنجلی میں جسکا حوالہ البیرونی نے دیا ہے شاگرد اپنے استاد سے سوال کرتا ہے "وہ کونسا معبود ہے جس کی عبادت انسان کو سعید بناتی ہے"۔ استاد جواب دیتا ہے۔ "وہ وہی ہے

جو ازلی و ابدی ہے - وہ عذاب و رحمت کے لئے کسی کا محتاج نہیں وہ انسان کے خیال میں نہیں آسکتا - وہ استاد بے مثل ہے اور کسی قسم کی تشبیہ اس کے لئے لغو ہے - وہ خود اپنے وجود سے موجود ازلی ہے وہ عالم و دانا ہے بلکہ وہ خود علم ہے اور لاعلمی کی صفت خدا میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی شاگرد پھر سوال کرتا ہے: "کیا اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ اور صفات ہیں" استاد جواب دیتا ہے - وہ بلند ہے اس کی برتر ذات مکان و ضرورت سے مستغنی ہے - وہ خالص نیکی ہے وہ علیم و خبیر ہے" شاگرد پھر سوال کرتا ہے "کیا وہ کلام کرسکتا ہے" استاد جواب دیتا ہے "چونکہ وہ عالم ہے اس لئے وہ کلام کرسکتا ہے" وغیرہ - اسی طرح بھاگوت گیتا میں باسدیو ارجن کے مکالمہ میں باسدیو فرماتے ہیں: "میں کائنات ہوں بلا ابتدا و آخر ہستی لاموت ہوں میں اپنی رحمت سے بے نیاز ہوں - مجھ سے کسی ہستی کی تشبیہ نہیں ہوسکتی میں کسی خاص فریق کا طرفدار نہیں - میں نے ہر ہستی کو اسکی ضرورت کا تمام سامان دیدیا ہے - اس لئے جو میری ہستی کو پہچانتا ہے اور میرے مانند ہونے کے لئے مجاہدۂ نفس کرتا ہے - اس کے علائق کی بیڑیاں کٹ کر اس کو آزادی و نجات ابدی حاصل ہوتی ہے"

ایک دوسری جگہ باسدیو نے فرمایا ہے" انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ اپنی ضرورت میں خدا کو یاد کرے - جو مجھے ازلی و لم یلد و لم یولد مانتا ہے - خالق اکبر جانتا ہے - وہی تمام انسانوں میں گناہوں اور خطاؤں سے مبرا ہے" فلاسفہ یونان و روما کے خیالات میں بھی بہت کچھ اس کے پرتو نظر آتے ہیں - سات حکمائے یونان جو ارکان عقل کے نام سے مشہور ہیں انکا خیال تھا کہ تمام چیزیں ذات واحد سے نکلی ہیں - اور انسان دوسرے غیر ذوی الارواح مخلوق سے یہ فرق رکھتا ہے کہ وہ ان سے ایک درجہ اس ذات واحد یا سبب اول سے قریب تر ہیں - ان حکماء کا خیال تھا کہ عالم ایک ہی شے ہے اور سبب اول ان میں مختلف جلوؤں سے ظہور کرتا ہے اور انسان جو سبب اول سے لو لگاتا ہے وہ آخرکار اس میں جذب ہوکر اپنی ساری ہستی فنا کردیتا ہے - افلاطون کے اس قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ: "دیوباس (خدائے واحد) جنکو غیر اقوام منجملہ اور دیوتاؤں کے ایک دیوتا جانتے ہیں بوجہ اس کے کہ اس کو بقا حاصل ہے - اور "دیوتاؤں سے جدا ہے" پھر ایک جگہ افلاطون نے کہا ہے "خدا ایک ہی ہے - خدا متعدد تعدادوں میں نہیں ہے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کے بیشمار دیوتا درحقیقت فلاسفہ کے نزدیک وہی صورت رکھتے تھے جو ہمارے یہاں فرشتوں کی ہے - عوام نے فرشتوں کو خدا کے درجہ تک بڑھا دیا جیسے عرب کے عوام نے ان کو خدا کی بیٹیاں کہنا شروع کردیا - چنانچہ جالینوس کا قول ہے کہ "یہ صحیح ہے کہ اسقلابوس دیوتا کسی زمانے میں انسانوں کے جامے میں تھا - اس کے بعد خدا نے اس کو ملائکہ کا درجہ دیدیا"

پس قرآن کا یہ اصول کہ "ولکل امۃ رسول فاذا جاء رسولہم قضی بینہم بالقسط وہم لا یظلمون - ایک حقیقت ہے جس کی بے نقابی کا دنیا کو ابھی انتظار ہے - عرب کی قوم جو بت پرستی میں دنیا کی کسی دوسری قوم سے کم نہ تھی - اس میں بھی نبوت کی آواز ایک زمانے میں گونجا کی - چنانچہ ہود پیغمبر کی بعثت کا ذکر قرآن میں موجود ہے - اس کی لفظ بلفظ تائید یمن کے اس مشہور کتبۂ حصن غراب سے ہوتی ہے جس نے دنیا میں صرف حضرت ہود کا وجود ہی ثابت نہیں کردیا بلکہ اسنے قرآنی امور کی بھی تائید کردی - (دیکھو فارسٹر کا قدیم جغرافیہ عرب)

پس انسان مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور رہے اگرچہ وہ باوجود اعلیٰ فہم و فراست رکھنے کے مذہب میں نہایت لوچ و لچر باتیں پیدا کرے مگر مذہب سے خالی ہونا انسان کے لئے ممکن نہیں - کیونکہ اس کا تعلق انسان کی سائیکالوجی سے ہے - اصل یہ ہے کہ انسان کو نہ

کی طرف لانے والا" ملک الموت کا ہاتھ ہے۔ انسان کی خودی اس کو اس بات کے لئے مجبور کرتی ہے کہ وہ غور کرے کہ یا تو اُسے اپنے دوسرے ابنائے جنس کی طرح ایک دن مرنا ہے۔ یا اپنے لئے موت کا یقین رکھکر اس سے بھاگنے اور بچنے کی کوشش کرے اور یہی دو صورتیں ہیں جو آپ کو مذہب کا خیال دلاتی ہیں۔ پھر چونکہ اُسے موت سے بچنے کا یقین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مضطر و پریشان ہو کر مذہب کی جستجو میں مشغول ہوگا۔ اور اب اس کے لئے صرف یہ تلاش باقی رہجائے گی کہ مذہبی عقائد میں سے کون اس کے دل کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

باقی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ باقی

سید مقبول احمد بی اے

چنگاری

(فسانہ)

(بسلسلۂ ماسبق)

---:(۶):---

یوسف کا اعادۂ مرض ہرچند نہ زیادہ شدید تھا نہ زیادہ طویل، لیکن تاثرات و نتائج کے لحاظ سے یوسف کی حیات کے لئے ایک ایسا نقطۂ انحراف (Turning point) اپنے اندر رکھتا تھا کہ اُس کو بھلا دینا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

اس سے قبل مس ہلن نے تیمارداریاں ایسے عالم میں صرف کی تھیں کہ یوسف بالکل بیہوش تھا، لیکن اس مرتبہ یوسف ہوش میں تھا، اسکا دماغ صحیح تھا اور اگر ایک طرف وہ مس ہلن کی جانفشانیوں کو دیکھ کر خاموشی کے ساتھ نہایت گہرا اثر قبول کرتا جاتا تھا، تو دوسری طرف مس ہلن بھی سمجھتی جاتی تھی کہ اس مرتبہ پہلے کی طرح یوسف کی خدمت، کسی بت کی پرستش نہیں ہے بلکہ ایک ایسی اثر پزیر چیز کو ہاتھ میں لینا ہے جو ہر لمس کے نقش کو قبول کر لینے والی ہے۔ اول مرتبہ جو کچھ اس نے کیا محض انسانی فرض شناسی کے احساس پر مبنی تھا۔ لیکن اس مرتبہ جو کچھ وہ کر رہی تھی یکسر نسائی ایثار تھا جس کے لئے دنیا نے ہمیشہ بڑی سی بڑی قربانی گوارا کی ہے۔

عورت کی صحیح فطرت کا اندازہ کرنا ہو تو اُسے اس وقت نہ دیکھو جب وہ عہد تمنا سے گزر رہی ہو، انتظار کرو یہاں تک کہ وہ مقصود کو پالے یا اس سے مایوس ہو جائے پھر اگر اس کا مدعا صرف دوسرے کے اندر جذبۂ پرستش پیدا کرنیکی حد تک ختم ہو جائے تو سمجھ لو کہ اس کے بعد وہ انتقام پر آمادہ ہوگی اور پھر یہ انتقام ایسا ہی شدید ہوگا جیسا وہ جذبہ جو مایوسی کے عالم میں اسے اپنے آپ کو ہلاک کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

یوسف، جس نے اسوقت تک نسائی فطرت کا بالکل مطالعہ نہ کیا تھا اس دوران میں صرف اس قدر سمجھنے میں کامیاب ہوا۔ کہ عورت بھی قدرت کی غیر ضروری پیداوار نہیں ہے اور مرد کی زندگی کی بعض خستگیاں ایسی ہیں جنھیں عورت ہی کا نرم و نازک لمس دور کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اب بھی اس حقیقت سے آگاہ نہ تھا کہ عورت سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنے کا عزم ایک شدید ترین جرم ہے اور فطرت کبھی نہ کبھی اس کا انتقام لے ہی لیتی ہے۔ مس ہلن سے اس کی پہلی ملاقات بالکل وہی نوعیت رکھتی تھی جو ایک اجنبی کی ملاقات ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد اس نے ایک دوستی کی سی صورت اس کو دینا چاہی تھی، لیکن مس ہلن جس کے سامنے یوسف کا وجود ایک ایسا معمہ تھا جس کے حل نہ کر سکنے کو وہ اپنی توہین خیال کرتی تھی، کسی اور فکر میں تھی اور آخر کار وہ اپنی فکر فضول میں کامیاب ہو کر رہی، یہاں تک کہ جس وقت یوسف بیماری سے اُٹھا ہے تو وہ اپنی زندگی کو مس ہلن ہی کا عطیہ سمجھکر اُٹھا اور اس کی غیور طبیعت اس خلش سے بے چین ہونے لگی کہ وہ کیونکر اس احسان کا اعتراف کر سکتا ہے۔

یقیناً اول اول اخلاق ہی کی دنیا میں یوسف کو ہلن سے تعلق پیدا ہوا، لیکن وہ غریب بے خبر تھا کہ عورت سے تعلق ہونے کی کیفیت دنیا میں ایک ہی ہے اور اس کو دائرہ کے جس نقطہ سے بھی شروع کیا جائے اسے پہونچنا اسی مرکز تک ہے جہاں مرد اپنے آپ کو بالکل بیدست وپا محسوس کرنے لگتاہے۔

یوسف بالکل صحیح وتوانا ہوگیا، وضع ومعاشرت بدل گئی، مشاغل میں بھی شان امارت پیدا ہونے لگی، اور رفتہ رفتہ وہ اسی سطح پر آگیا جہاں مرد ایک عورت کے لئے سراپا نمائش نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن سب سے زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ اس نے آخرکار یہ بھی محسوس کرلیا کہ زندگی خواہ کسی چیز کا نام ہو، لیکن زندگی کا لطف عبارت ہے عورت سے اور وہ عورت اس کیلئے سوائے ہلن کے کوئی اور نہ ہوسکتی تھی۔

اصولاً وہ اس سے واقف تھا کہ عورت کے سامنے کیونکر جذبۂ محبت پیش کیا جاتا ہے، اس نے بہت سے فسانے پڑھے تھے اس نے دوران تعلیم میں متعدد ناولوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اور اس لئے جہاں تک 'نظریہ' کا تعلق ہے وہ اس سے خوب آگاہ تھا، لیکن جب اسپر عمل کرنے کا وقت آیا، جب سوال خود اپنے دل کا پیش ہوا، تو اس کی تمام آگاہیاں بیکار ثابت ہوئیں، اور کسی طرح اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دل کا یہ کانٹا کیونکر زبان سے نکالا جائے۔

باوجودیکہ مس ہلن، یوسف کے لئے سراپا توجہ تھی، یکسر انعطاف والتفات تھی، لیکن یوسف جس وقت اپنے آپ کو دیکھتا تھا، اپنے تمام حالات پر غور کرتا تھا تو اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا، کیونکہ جس زندگی کا عادی اس کو مس ہلن نے بنا دیا تھا اب وہ ایک نشہ کی سی تکلیف رکھتی تھی اور یوسف کی قدرتاً یہی خواہش ہونی چاہیئے تھی کہ وہ اس لطف میں دوام پیدا کرے، لیکن جب وہ یہ خیال کرتا تھا کہ مس ہلن کیوں اپنی زندگی اس کے ساتھ وابستہ کرنے لگی، اس میں کیا ہے جس کے لئے وہ اپنی وسیع دنیا کو ترک کرکے مجبور وپابند ہوجائے گی، تو ساری تعمیر خیال خاک میں ملجاتی تھی اور وہ متحیرانہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا۔

مس ہلن اس کے تمام جذبات سے آگاہ تھی اور کیوں نہ ہوتی جب کہ وہ خود اس کے پیدا کئے ہوئے تھے، لیکن اب مشکل سے یوسف کو کوئی موقع ایسا دیتی تھی کہ وہ اظہار تمنا کرسکے، اب اس کی تمام باتیں نہایت سخت بے لطف مادیات کے متعلق ہوا کرتیں، یا خشک سیاسیات، اس کا موضوع سخن ہوتا۔ یوسف حیران تھا کہ یہ انقلاب اس میں کیوں ہوگیا۔ ایک وقت تھا کہ وہ سوائے حسن وعشق، نظریۂ شعر وشاعری، اصول فنون لطیفہ تجزیۂ جذبات جنسی کے اور کوئی بات ہی نہ کرتی تھی۔ اس حال میں کہ وہ گھبرا گھبرا کر بھاگ اٹھتا تھا یا اب وہ وقت آیا کہ اسے تمنا رہتی تھی کہ مس ہلن کوئی ایک ہی جملہ زبان سے ایسا ادا کردے کہ اس کو کسی لطیف بحث کے چھیڑنے کا موقعہ ملے لیکن اس میں کامیاب نہ ہوتا۔

یہاں تک کہ معمولاً جب صبح کو وہ گلدستہ سامنے لاکر پیش کرتا تو بجائے اس کے کہ وہ پھولوں کی خوشنمائی کا ذکر کرتی، نباتات کے متعلق مسٹر بوس کے انکشافات سے بحث کرنے لگتی اور ایسا خشک چہرہ بناکر کہ یوسف کو سوائے خاموش سنتے رہنے کے کوئی چارہ نہ ہوتا ——— ایک خنک شب ماہ میں ساحل کے قریب قریب یوسف کشتی کھیتا ہوا چلا جا رہا تھا، ہارسنگھار اور

کرونارے کی جھاڑیوں سے خوشبو نکل نکل کر پھیل رہی تھی، ایک عشق انگیز روشن سکوت سطح آب اور تمام فضا پر طاری تھا کہ دور سے بانسری کی آواز آئی، مس ہلن بانسری کی عاشق تھی۔ یوسف نے اس خیال سے کہ اس وقت ان کیفیات کا اجتماع یقیناً ایک کامیاب سفارش ثابت ہوگا۔ اُس نے بہت جرأت کر کے کہا کہ "آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس وقت کیسا سحر ٹپک رہا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ ذرہ عشق.........."۔ وہ یہ فقرہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ مس ہلن نے چونک کر کہا "مسٹر یوسف، آج کا اخبار آپ نے دیکھا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتی کہ مصر کیساتھ برطانیہ کا موجودہ طرز عمل کیونکر قابل ستائش سمجھا جا سکتا ہے، حیرت ہے کہ وہاں کی وزارت کیوں نہیں بیدار ہوتی۔ اور وہاں کی رعایا اب تک اپنے حقوق کی پامالی کو گوارا کرتی رہیگی"

اس وقت یوسف کی وہی حالت ہوئی جیسے دفعتہً کسی کا گلا گھونٹ کر خاموشی کے ساتھ تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا جائے مجبوراً اُسے وہ "ذرہ ذرہ کا عشق" ترک کرنا پڑا، لیکن کچھ سوچکر تھوڑی سی خشونت کیساتھ بولا "جی ہاں مصر کی مجبوریوں سے میری مجبوریاں بھی کم نہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اُن کا ذکر کیا جاتا ہے اور اِن کو فراموش۔ خدا جانے دنیا کے کتنے دردناک واقعات ایسے ہیں جو فسانہ بننے سے پہلے ہی محو کر دئے جاتے ہیں"۔

بات سے بات پیدا کرنے کی ذہنیت یوسف میں کبھی نہ تھی لیکن جہاں اور بہت سے انقلاب اس کی زندگی میں ہوئے، یہ بھی ایک تغیر رونما ہوا اور چونکہ سلسلۂ گفتگو میں کسی کی طرف سے ایسی ذہنیت کا ظاہر ہونا ہمیشہ مخاطب کو مغلوب کر دیتا ہے۔ اس لئے مس ہلن نے پھر اس کو ٹالنا چاہا اور زیادہ سنجیدگی کے ساتھ بولی کہ "ذاتی و انفرادی مجبوری کا فسانہ بننا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور نہ دنیا کو فرصت و ضرورت کہ اسے سنے، آپ کے ایک ایک کاشتکار کا دل اس لحاظ سے ایک غمکدہ ہوگا اور خدا جانے کتنی نزالہ باریوں کے زخم وہ اپنے سینے میں لئے ہوئے ہوگا، لیکن کیا آپ پر کیا الزام اگر آپ اس سے بے خبر ہیں'...... بہت دیر ہوگئی اب آپ جلد واپس چلئے، مجھے ایک نہایت ضروری خط لکھکر اسی وقت روانہ کرنا ہے"۔

اس وقت یوسف کی مجبوری و بیچارگی اس حد تک پہونچ گئی تھی جس کے بعد رد عمل شروع ہو کر انسان از سر نو اپنے اندر جرأت و جسارت محسوس کرنے لگتا ہے، وہ سمجھتا تھا کہ جو کچھ کہنا ہے، اسی وقت کہدینا چاہئے، ورنہ پھر موقعہ ملنا دشوار ہے۔ لیکن جب مس ہلن کے موجودہ احتراز کو دیکھتا تھا تو پھر اس کا نفس ملامت کرنے لگتا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ کشتی کا رخ پھیر کر واپس جا رہا تھا اور ان تمام حالات پر غور کرتا جاتا تھا کہ گھاٹ آگیا۔ وہ کشتی سے اترا اور مس ہلن کو اُتارنے کے لئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ یہاں تک تو جو کچھ ہوا وہ یوسف کے عالم ہوش کی باتیں ہیں، لیکن جب مس ہلن کا نرم و نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ بالکل بے اختیار ہوگیا اور قبل اس کے کہ مس ہلن اپنا ہاتھ علحدہ کرتی، یوسف نے اسی جگہ دو زانو ہو کر پیام دل کہدیا۔

مس ہلن نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولی "یوسف صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو آپ کو ایک غیر معمولی انسان سمجھتی تھی، مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ بھی آخر کار اسی سطح پر آگئے جہاں انسان بجائے روح کے صرف گوشت پوست کی نمائش کرنے لگتا ہے"

یوسف "اگر میں واقعی کسی ایسی سطح پر آگیا ہوں، جو آپ کے نزدیک پست ہے تو اس کا الزام مجھ پر نہیں ہے آپ نے میرے ساتھ

وہ احسان نہیں کیا جس کی یاد میرے سے محو ہو سکے، پھر اب میں اس کی عوض میں سوائے اس کے کیا کر سکتا ہوں کہ اپنی زندگی کو جو حقیقتاً آپ ہی کی بخشی ہوئی ہے، آپ کے قدموں پر ڈال دوں"

مس ہلن "میں نے جو کچھ کیا آپ اسے احسان سمجھیں یا کچھ اور لیکن میں تو اُسے ایک فرض انسانی سمجھتی ہوں، اور اس لئے اس کا کوئی عوض قبول کرنے کے لئے طیار نہیں۔ علاوہ اس کے یوں بھی یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ منت پذیری کا ذکر اس طرح کیا جائے گویا آپ نے خود کوئی احسان مجھ پر کیا ہے۔ اگر آپ ہی کے یقین و اعتقاد کے مطابق میں نے کوئی احسان کیا ہے تو اس کا عوض یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ اس کے عوض میں، مجھی کو مجھ سے چھین لیں۔ جس وقت تک ہیئت اجتماعی کے قانون میں مرد کو کچھ بھی مرجح درجہ حاصل ہے، اس وقت تک میں یا کوئی ذی حس عورت نکاح کی توہین کو گوارا نہیں کر سکتی۔ فطرت نے ہر چیز کو آزاد پیدا کیا ہے اور آزادی کو قایم رکھنا ہر ذی حیات کا فطری حق ہے، دنیا میں پابندی کا خیال صرف ایک فریب ہے، اور کسی ایک حالت پر قائم رہنا ارتقار کا دشمن نسیم آزاد ہے، نکہت آزاد ہے، آبشار آزاد ہے اور ہر وہ چیز آزاد ہے جو لطیف ہے، پہاڑوں کے جمود میں ہیبت ہو تو ہو لیکن لطافت مفقود ہے" وہ یہ باتیں کرتے کرتے مکان تک پہونچ گئی اور جب یوسف رخصت ہونے لگا تو اس نے یہ کہکر کہ "کل صبح کو میں چلی جاؤنگی" دروازہ بند کر لیا اور یوسف کو مبہوت و متحیر چھوڑ گئی۔

(۷)

مس ہلن کو گئے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں یوسف کی زندگی نے جو تغیرات قبول کئے وہ نہایت عجیب و غریب تھے۔ مشاغل کاشتکاری کے ساتھ ظاہری وضع و معاشرت کی سادگی تو اس سے قبل ہی رخصت ہو چکی تھی لیکن مس ہلن کے جانے کے بعد قلب و دماغ کا توازن بھی درہم برہم ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس میں ایک نہایت خطرناک انتفاعیت (Utilitarianism) کا ذوق پیدا ہو چلا ہے۔ مس ہلن کی معیت اور اس کی گفتگو نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک اشتعال پذیر پارہ کے ساتھ آگ کی چنگاری کرتی ہے اور اس کے جذبات کی وہ حالت ہوئی جیسے تند شراب سر بند مینا کو توڑ کر باہر اُبل پڑے

گزشتہ صحبت کے ختم ہونے کے بعد کامل پندرہ روز تک اُس نے غور کیا کہ آیا وہ اپنے جذبات کو ضبط کر سکتا ہے یا نہیں اور جس نتیجہ پر پہونچا وہ یہ نہ تھا کہ ضبط ممکن نہیں بلکہ اس کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ ضبط کی ضرورت ہی نہیں ہے، اسی کے ساتھ اس نے مسئلہ آفرینش، نظام تمدن، مذہب و اخلاق، رابطۂ نکاح، فلسفۂ حسن و عشق، اور خدا جانے کن کن مسائل پر غور کیا۔ اور آخر کار پورے وثوق کے ساتھ اس کے دماغ نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ :-

۱ قدرت پیدا کرنے کے بعد نہ مخلوق کے اخلاق کی ذمہ دار ہے اور نہ مخلوق پر قدرت کا کوئی خاص حق ہے۔

۲ تمدن کا قانون نام ہے اس ظلم کا جو وہ افراد پر روا رکھتی ہے۔

۳ مذہب ایک جنون ہے جس سے صرف سلطنتیں قائم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

۴۔ نکاح ایک لایعنی پابندی ہے جس کے ذریعہ سے تخیل جنسی کو برباد کیا جاتا ہے۔
۵۔ حسن و عشق مسمیٰ ہے صرف شباب سے فائدہ اُٹھانے کا۔
۶۔ غایت حیات سوائے اس کے کچھ نہیں کہ شباب کو اس طرح بسر کر دیا جائے کہ ضعیفی میں اس کے اعادہ کی حسرت باقی نہ رہے

جب تک اس کا خیال اس حد تک نہ پہونچا تھا اس کی روح مس ہلن کے لئے حزین و ملول تھی، لیکن جب اُس نے اصول زندگی یہ مقرر کرلئے تو اس کی روح اس فشار سے آزاد ہوگئی اور اب اس کا تمام حزن و ملال آگ بنکر اس کے ریشہ ریشہ میں دوڑ گیا۔ اب وہ یکسر ہیجان تھا، اُس کے خون میں ایک ناقابل ضبط شباب دوڑ رہا تھا اور اس کے سر میں ایسا نشہ پایا جاتا تھا جو صرف قوت بہیمیہ کو اُبھار سکتا ہے۔

اُس نے تمام احباب کو اپنی زندگی کے اس تغیر سے آگاہ کیا اور مس ہلن کو بھی ایک تحریر روانہ کی جو الفاظ کے لحاظ سے بہت مختصر لیکن معنی کے لحاظ سے نہایت بسیط تھی اور غالباً اس کی زندگی کا یہی پہلا ادبی کارنامہ تھا اس نے لکھا۔

"پہلے اگر مجھے افسوس کا افسوس تھا کہ نام کے لحاظ سے میری صورت کیوں اچھی نہیں ہے، تو آج میں اس تغیر پر مسرور ہوں کہ اب میری فطرت بھی یوسف کی طرح نہیں رہی۔ کیا یہ فخر کم ہے کہ جو کنعان کے حسین یوسف سے نہ ہوسکا، آج خلد آباد کا زشت رو یوسف اس کے کرنے پر قدرت رکھتا ہے، آپ نے دیکھا فطرت جب بخیل ہوتی ہے تو کس قدر اور فیاضی پر آمادہ ہوجاتی ہے تو کتنی۔ کس قدر بے عقل ہیں وہ لوگ جو دنیائے ہنگامہ میں نظام و اصول کی جستجو کرتے ہیں۔ اخلاقی مذہب کا معیار قائم کرتے ہیں، حالانکہ موت ہر وقت اعلان کرتی رہتی ہے کہ جو کچھ کرنا ہو کرلو، زندگی دوبارہ ملجائے تو ملجائے لیکن جوانی پھر نہیں مل سکتی۔ کس قدر خوش نصیب تھے وہ لمحے جب اول اول آپ نے میرے اندر یہ احساس پیدا کیا، میری سوئی ہوئی فطرت کو بیدار کیا۔ میں سمجھتا تھا انسان پیدا ہوا ہے صرف کام کے لئے اور رات دن خستہ رہتا تھا، آپ نے بتایا کہ وہ صرف ہنسنے اور کھیلنے کے لئے بنایا گیا ہے اور اب میں بجائے خستگی کے خاص نشاط اپنے اندر پاتا ہوں۔ اب تو غالباً آپ کو میرے ملنے سے احتراز نہ ہوگا، کیونکہ اگر آپ تیتری کی طرح ہر وقت آزاد رہنا ہی پسند کرتی ہیں، تو میں بھی اُسی کو پسند کرتا ہوں کہ اس کا تعاقب کیا جائے لیکن صرف اس لئے کہ جب ہاتھ آجائے تو تھوڑی دیر تک چٹکی میں اس کا تلملانا دیکھ آزاد کر دیجائے۔ میں اس خط کے جواب کا انتظار نہ کرونگا پرسوں خود یہاں سے روانہ ہوکر آپ کی معیت میں سحر بنگالہ کی قوتوں کا امتحان کرنے کے لئے پہونچتا ہوں۔

یوسف سمجھتا تھا کہ مس ہلن اس کے اس تغیر پر بہت مسرور ہوگی اور اس کی آغوش اُسکے لئے کھلی ہوگی، لیکن اس کے حیرت کی انتہا نہ رہی، جب کلکتہ پہونچنے کے بعد اس کو بجائے مس ہلن کے اس کا ایک خط ملا جس میں اس نے بہت افسوس ظاہر کیا تھا اور ایک نہایت اہم ضرورت سے دارجلنگ چلے آنے کی معذرت کی گئی تھی۔

اس نے فوراً وار جلنگ تار دیا اور اسی وقت وہاں روانہ ہو گیا۔ لیکن جب وہاں پہونچکر ہوٹل کے منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دو گھنٹہ قبل مس ہلن ہوٹل چھوڑ چکی ہیں لیکن اس کے نام ایک تحریر دے گئی ہیں اس میں لکھا تھا:۔

"مسٹری کا تعاقب آسان نہیں، جنگلی میں اس کو تلملاتے ہوئے دیکھنا یقیناً پر لطف منظر ہے، لیکن آپ کو نہیں معلوم کہ جس مسٹری پر آپ قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس تک دسترس حاصل کرنے کے پہلے سر دینا ضروری ہے"

یہ تحریر پڑھکر جو حالت یوسف کی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص اپنی جگہ کر سکتا ہے، وہ غالباً اس خط کو دیکھ کر فوراً واپس...... جاتا اگر وقت ہوتا لیکن، اس نے کچھ تو اس خیال سے کہ انتظار کرنا ضروری ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ ہوٹل کے لوگ اس کو سبک نہ سمجھیں، حکم دیا کہ اسباب کس کمرہ میں پہونچا دیا جائے اور خود بھی وہاں پہونچکر اس فکر میں مستغرق ہو گیا کہ اسے کیا کرنا چاہئیے

باقی۔۔۔۔۔۔۔۔ باقی

نیاز

سفرنامۂ اندلس

مرتبہ عالیجناب قاضی ولی محمد صاحب سکریٹری اسٹیٹ کونسل

جسمیں یکصد دیار و امصار۔ قصبات و حصون۔ میدان جنگ وغیرہ کے چشم دید تاریخی حالات مصنف ممدوح الشان نے سنہ ۲۴ء میں طولانی سیاحت کر کے قلمبند کئے ہیں اور جسمیں قرطبہ۔ غرناطہ۔ اشبیلیہ۔ بطلیلوس۔ بلنشیہ۔ مرسیہ۔ برشلونہ۔ طلیطلہ۔ شاب۔ وادی الحجارہ جبل طارق۔ جزیرۃ الخضرا۔ ارجونہ۔ سرقسطہ۔ قلعہ رباح۔ طنجہ۔ قصر الصغیر وغیرہ کے مفصل حالات معہ یکصد تصاویر عکسی و نقشہ جات آثار اسلامی مثل مساجد۔ قلعہ جات پل۔ محلات۔ منارہ جات۔ پن چکی۔ زنانہ و مردانہ لباس مسلمانان اندلس۔ زیورات۔ الحمرا۔ القصر الطارق۔ قصر جعفریہ۔ مسجد قرطبہ۔ مدینہ زہرا قابل دید ہیں۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات۔ عبارت دلچسپ و دلکش اور حالات تاریخی و جغرافیائی میں نہایت صحت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر ایک روز کے مطالعہ کے بعد ناپسند ہو تو واپس کر دینے پر بعد منہائی محصولڈاک بالقی قیمت واپس کر دیجاتی ہے قیمت آٹھ روپے کلدار محصول ڈاک وغیرہ چودہ آنے۔ اس قدر تصاویر آج تک کسی اردو کتاب میں شائع نہیں ہوئیں۔

مصنف ممدوح الشان سے طلب کیا جا سکتا ہے

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(ملاحظہ ہو نگار ماہ فروری سنہ ۱۹۲۸ء)

اسلامی ہندوستان کی مضبوط ترین جائے پناہ شمال مغربی حصہ ہے اور وہاں اسلام کی حالت مایوس کن نہیں ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تباہی کے قریب آلگا ہے۔ ذہنی لحاظ سے وہ اپنے ہندو ہمسایوں کے مساوی ہیں۔ مگر اخلاقی لحاظ سے وہ ان سے اعلیٰ ہیں اور وہ ابھی تک یہ بات بھولے نہیں کہ زمانۂ حال تک سلطنت ہندوستان کا انتظام ان کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنے زوال کے متعلق یہ رائے نہیں رکھتے کہ وہ اس کے مستحق تھے یا یہ کہ وہ لاعلاج ہے۔ تاریخی حیثیت سے وہ تاتاری، ایرانی اور افغانی فاتحین کی اولاد ہیں جنھوں نے مختلف زمانوں میں شمال مغربی حصہ سے ہندوستان پر حملے کئے یا ان نومسلموں کی اولاد ہیں جو راجپوت سے مسلمان بنائے گئے تھے۔ چند شریف گھرانوں کے سوائے اُن کی نسل خالص نہیں رہی لیکن ان کے مولد کی روایات جوں کی توں قائم ہیں اور یہ ان کی کمزوری اور طاقت دونوں کا باعث بنی ہوئی ہیں، طاقت تو اس لئے کہ ان کے ذریعہ وقار اور عزت کا ایک معیار قائم ہو جاتا ہے جو ہر سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے اور کمزوری اس لئے کہ ان کی وجہ سے وہ زندگی کے معمولی پیشوں کو حقارت سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں ؎

شمالی ایشیا سے جو اسلامی اقوام اٹھی ہیں ان کی عام برائی فتح کا غرور ہے اور ہندوستان کے مسلمان اس لحاظ سے مستثنیٰ نہیں کئے جا سکتے۔ مغلوں نے کبھی تجارت کی جانب رغبت نہیں کی بلکہ وہ آباد ہونے کے بعد سرکاری ملازم ہوگئے خواہ وہ ملازمت شہری ہو یا فوجی ان کی نسلوں میں اب تک یہی غرور چلا آرہا ہے۔ ہندوستان میں ان پر مصائب کے پہاڑ یکے بعد دیگرے ٹوٹے۔ مرہٹوں کی لڑائیوں سے تنگ آکر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اتحاد کرلیا اور اس طریقہ سے سلاطین مغلیہ موخر الذکر کے زیر اقتدار آگئے اور بالآخر جب دہلی کی شہنشاہیت اس میں جذب ہوگئی تو حکومت کے اختیارات تمام و کمال مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے، یہ تبدیلی یکقلم وجود میں نہیں آئی بلکہ آہستہ آہستہ جیسا کہ جدید نظام کا نفاذ ہوتا رہا ہے۔ جن اشخاص پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑا وہ مالکان اراضی تھے۔ ایک خاص قانون اراضی کے ذریعہ تمام اصحاب جائداد سے ان کے قبالے طلب کئے گئے اور مسلمان جن میں اکثروں کے پاس تحریری اجازت نامے نہ تھے، اپنی وسیع جائدادوں سے محروم کردئے گئے اور اس طرح قلاش رہ گئے۔ فوجی ملازمتوں میں اُن کیلئے میدان موجود نہ تھا اِس لئے کہ بہت بڑی حد تک دیسی افواج کو اڑا دیا گیا تھا۔ اور سب سے آخر میں چونکہ اس قانون کے ذریعہ سرکاری زبان فارسی سے انگریزی قرار دیدی گئی تھی اس لئے شہری ملازمتوں میں بھی ان کی نمایاں حیثیت بالکل جاتی رہی مسلمان اب تک ہندوؤں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ بڑھے ہی ہوئے تھے کیونکہ اردو انکی مادری زبان تھی اور فارسی ان کی کلاسیکل زبان تھی لیکن

انگریزی میں وہ بہت پیچھے تھے۔ جو تجارتی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور اس لحاظ سے تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں کی وہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مزید براں انگریزی کی تحصیل اسکولوں کے سوائے اور کہیں ممکن نہ تھی اور مسلمان اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے کے یوں مخالف تھے کہ اس سے لامذہبی پھیلتی ہے۔ لہذا ان کی ملازمت کے ذرائع ہر طرف سے محدود ہو گئے اور اس کا قدرتی نتیجہ افلاس کی شکل میں نکل رہا ہے جو روز بروز ترقی پر ہے۔ ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت نے جس نے اودھ اور دہلی میں خاص اسلامی صورت اختیار کر لی تھی، انگریزی حکومت کو مسلمانوں سے کلیۃً بدظن کر دیا جس کا خمیازہ انہیں بعد میں مادی نقصان میں اٹھانا پڑا +

ساتھ ہی یہ مسلمہ امر ہے (اگرچہ مجھے اس کی پوری پوری تشریح معلوم کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا) کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان بلحاظ تعداد بہت سرعت کے ساتھ ترقی کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ ادنیٰ ذاتوں کے ہندو مسلمان بن جاتے ہیں یا ممکن ہے کہ دوسرے اسباب ہوں، لیکن یہ یقینی امر ہے کہ اگرچہ قدیم شمار کے حساب سے ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد تقریباً تین کروڑ تھی اور حال میں ڈاکٹر ہنٹر نے ان کا اندازہ چار کروڑ کیا ہے لیکن آخری مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ۵ کروڑ ہے اگرچہ ہندوستان کی عام مردم شماری میں اسی نسبت سے اضافہ نہیں ہوا۔ لہذا اب ہم شمالی ہندوستان میں جس غیر اطمینان بخش صورت حالات سے دوچار ہو رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کی آبادی روبترقی ہے اور دوسری طرف وہ کم خوشحال ہوتے جا رہے ہیں دوسرے یہ کہ یہ قوم اگرچہ نظری طور پر نظم ونسقِ سلطنت کے قابل ہے تاہم اسے انتظام ملک میں شریک نہیں کیا جا سکتا، تیسرے یہ کہ یہ وہ قوم ہے جو اپنے مصائب کو ان غیر موافق حالات کا نتیجہ سمجھنے میں حق بجانب ہے جنھیں امپیریل گورنمنٹ نے ان پر عائد کر دیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان غیر مطمئن حالت میں ہیں اور بےچین ہیں اور واحد سوال یہ رہ جاتا ہے کہ انکی طاقت جسمیں تباہی کی مایوسی کا احساس بھی شامل ہے کس مصرف میں آئیگی۔ اس کے دو مصرف ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس سے اپنی اور عام بھلائی متصور ہو یا وہ جس سے اپنا اور عام نقصان ہوتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ امر ہندوستان کے موجودہ حکمراں کے حیطۂ اختیار میں ہے کہ وہ مسلمانوں کی طاقت کو اول الذکر مصرف میں خرچ کریں اور موخر الذکر مصرف سے ان کی توجہ کو ہٹا دیں +

جو اصحاب ہندوستان میں امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ خود ملک کے اندر اور اُس کی سرحد پار ایسے اثرات کام کر رہے ہیں جو اس امن وامان کے مخالف ہیں۔ مجھے روسی حملہ کا خطرہ نہ کبھی رہا ہے اور نہ میں اس کا قائل ہوں اگر اس حیثیت سے نگاہ ڈالی جائے کہ روس ہندوستان کا دشمن ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بےضرر دشمن ہے اور رہیگا۔ اور میں ہندوکش یا اصلی سرحد تک اس کی آمد کو اطمینان کیساتھ دیکھتا بشرطیکہ یہ ناممکن ہوتا کہ وہاں دوست کی حیثیت سے کبھی نہیں آسکتا لیکن دوست کی حیثیت سے میں اس سے خائف ہوں۔ اگر ہماری خود غرضانہ حکومت کے نظام میں (جو ہندوستان کے فائدہ کے بجائے خود ہمارے فائدہ کے لئے قائم ہے کسی قسم کی تبدیلی نہ کی گئی یا اگر ہم باشندگان ہند کو بالآخر سیلف گورنمنٹ (سولیدلج) کا یقین دلانے سے انکار کرتے رہے جس کے باعث وہ اطمینان کے ساتھ اپنی امیدوں کے پورا ہونے کے موقع کا انتظار کرنے کے قابل ہو جائیں گے

اگر ہم ان کے ساتھ محکوم دشمنوں کا سا سلوک روا رکھیں گے یا انہیں اپنے کام کے لئے غلام بنا رکھیں گے۔ یا ایسے اشخاص کے طور پر جو حقوق سے معرا ہوں، تو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر تمام بیرونی دنیا ہندوستان کی دوست بن جائیگی اور روس چونکہ سب سے قریب ہے، اس لئے وہ سب سے بڑھکر دوستانہ روش اختیار کر لیگا +

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ حالات میں زار کی حکومت بہت کچھ پیش کر سکتی ہے اور اگر انکار کرنے سے پیشتر باشندگان ہند اسپر اچھی طرح سے غور و خوض کر لیں تو یقیناً وہ معاف کئے جا سکتے ہیں روسی مشرقی ہے اور اغلب گمان یہ ہے کہ غیر ہمدرد سرکاری انگریز کے مقابلہ میں اس کا آقا بن جانا کم نفرت انگیز ہوگا۔ لیکن یہ بھی یقین سے بہت بعید ہے کہ ہندوستانی توقعات کے برعکس وہ اپنے تئیں آقا کے طور پر پیش کریگا۔ ممکن ہے کہ وہ اتحادی کی حیثیت سے جلوہ گر ہو اور یہ کہے کہ میں تم کو انگریزی مالی نظام کے مہلک پنجہ سے رہائی دلانے آیا ہوں اور یہ کہ میں آزادی، کفایت شعاری اور مالی ترقی کا حامی رہونگا کون کہہ سکتا ہے کہ روس کسی جدید تجارتی معاہدہ کے بدلہ میں ہندوستان کو کامل ہوم رول عطا نہیں کریگا اور اور اس طریقہ سے ہماری محبت کو زائل نہیں کریگا؟ ہندوستان کو اس امر کی ترغیب دینا کہ اسے مجوزہ تبدیلی سے فائدہ پہنچیگا کچھ مشکل نہ ہوگا اور انگریز ہونے کی حیثیت سے مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہر امر میں اسے نقصان رہیگا۔ بہر صورت یہ ممکن ہے کہ لوگ سمجھ کر کہ اگر برا سے برا بھی نتیجہ نکلا تو موجودہ بدترین حالت سے تو برا نہ ہوگا۔ تبدیلی کی خواہش کو اچھی نظر سے دیکھنے لگ جائیں +

اسوقت اگر کوئی قوم ایسی ہے جسپر اس قسم کے دلائل کا سب سے زیادہ اثر ہو سکتا ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ موجودہ نظام اُن کیلئے تباہی انگیز ہے حالانکہ سرحد سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ان کے بھائی بند ہیں جو ابھی تک حکومت کر رہے ہیں، اس سے بڑھکر اور زیادہ قدرتی امر کونسا ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے امداد کے متوقع ہوں یا اُن سے پرے کی زیادہ زبردست قوم سے مدد کے طالب ہوں بشرطیکہ وہ اپنے تئیں انکا مذہبی محافظ ظاہر کرے۔ گزشتہ چند سال کی ہماری سیاسی حماقت نے اس بات کو پہلی مرتبہ ممکن کر دکھایا ہے اور جو بات کہ گزشتہ نسل میں موہوم نظر آتی تھی وہ اب عملاً خطرہ ثابت ہو رہی ہے +

قدیم عثمانی اتحاد میں خواہ کچھ ہی خرابی کیوں نہ ہو، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہندوستانی مسلمان اسے بیحد پسند کرتے تھے۔ اور اُسے دنیائے اسلام اور انگلستان کی دوستی کی علامت تصور کرتے تھے اس کی جمہوریت کو اسلام کے سب سے بڑے دشمن کی قابل رشک حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی خیال سے جنگِ افغانستان کو کم سے کم ابتدائی منازل میں پسند کیا گیا کیونکہ اس سے شمالی طاقت کی شکست مراد لی گئی تھی۔ اُسے صرف بعد میں بری نظر سے دیکھا گیا۔ لیکن معاہدۂ برلن کے مشکوک انتظامات، جزیرہ قبرص کا بدنام کرنے والا قبضہ اور ٹیونس کی حوالگی (جب یہ باتیں رفتہ رفتہ معلوم ہوئیں تو انہوں نے) لوگوں کے خیالات میں ہیجان پیدا کر دیا اور انہیں اس سے زیادہ سخت حوادث کے لئے آمادہ و تیار کر دیا بالخصوص جبکہ انگلستان نے مصر میں کھلم کھلا ظالمانہ روش اختیار کی +

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمانان ہند نے عربی سے دوران جنگ میں ہمدردی کا اظہار کیا۔ انھوں نے سلطان کے اعلان جسمیں عربی کی بغاوت کا ذکر تھا، غلط مفہوم پیدا کرنے پر اظہار نفرت کیا اور اب گزشتہ دو سال سے یہ حالت ہے کہ روس اُن کا

ویسا دشمن نہیں رہا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بے اعتمادی پورے طور سے موجود ہے۔ انگریزی وزارت کی وفاداری کے مقابلہ میں انگریزی تاج کی وفاداری ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلی تھی لیکن یہ امر بالکل یقینی ہے کہ جنگ کے بعد سے مصر کی تباہی کی تاریخ اور گورنمنٹ کے بظاہر اس ارادہ نے کہ جوش اسلام کے لئے مفید طلب ہوا سے تباہ کر دیا جائے، چاروں طرف انقلاب پیدا کر دیا ہے قسطنطنیہ پر جب سے زوال طاری ہوا ہے دنیائے اسلام ایک حامی کی متجسس رہی ہے اور اگر انگلستان نے اس عہدہ کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو یہ عہدہ کسی دوسری عیسائی طاقت کو دیدیا جائیگا +

میرے خیال میں یہ طریقہ وہ ہے جس کے ذریعہ مسلمانان ہند اپنی بہت سی برائیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں علاوہ ازیں ایک اور طریقہ بھی ہے جو میرے خیال میں زیادہ اُمید افزا ہے (اور یہ امر ابھی تک ہماری گورنمنٹ کے اختیار میں ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس کے انتخاب پر مائل کرے) تین سال ہوئے میں نے اپنی کتاب "مستقبل اسلام" میں ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ ہز میجسٹی ملکہ معظمہ سے سلاطین مغلیہ کا شاہی لقب اختیار کر لینے کے بعد سے کیا کیا توقعات رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر سلطنت مغلیہ کا جانشین ہونے کی حیثیت سے ہز میجسٹی کے فرائض ہندوستانی مسلمانوں سے کیا ہیں۔ اور جب گزشتہ موسم سرما میں میں ہندوستان میں تھا، تو مجھے یہ دیکھکر بہت خوشی تھی کہ میرا بیان بالعموم پسند کیا گیا۔ ہندوستانی مولویوں کی جسمیں شیعہ اور سنی دونوں شامل تھے، یہ رائے تھی کہ ہز میجسٹی نے قیصر ہند کا لقب اختیار کر لینے سے مسلمانوں کی جانب ایک ایسی قانونی ذمہ داری اختیار کر لی ہے کہ جس کی رو سے وفاداری کے عوض میں خاص حفاظت کے مستحق ہوگئے ہیں بالخصوص ایسے معاملات میں جنکا تعلق ان کے مذہبی اوقاف، ان کی تعلیمی ترقی اور انتظامات متعلقہ حج سے ہو' اور انہوں نے اردو میں میری کتاب کا ترجمہ بھی شائع کر دیا تھا +

مذہبی اوقاف کے بارے میں میں نے ہر جگہ یہی شکایت سنی کہ ان کا غلط مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت اراضی ملکیت کا مسئلہ در پیش تھا تو اسوقت بہت سی زمینیں اس عذر پر ضبط کر لی گئیں کہ قبالوں کے اندراجات درست حالت میں نہیں تھے۔ بنگال میں محسن ٹرسٹ کے مقدمہ کا اگرچہ کسی حد تک معقول فیصلہ کر دیا گیا ہے تاہم اس کے بیان کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ گورنمنٹ نے اس کی نا انصافی کو اب تسلیم کر لیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس قسم کے بیشمار مقدمات میں نا انصافی برتی گئی ہے۔ اس خاص مقدمہ میں ایک مالدار مسلمان نے بہت سی جائداد صاف طور پر وقف کر دی تھی لیکن گورنمنٹ کئی سال سے اس کی آمدنی کا روپیہ اسلامی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ہندوؤں کی تعلیم پر صرف کرتی رہی اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مجھے بار بار یہ اطلاع دی گئی ہے کہ جائداد کا کافی حصہ ابھی تک گورنمنٹ کے قبضہ میں ہے اور یہ کہ اگر اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی اہم ضروریات اسی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لیٹنر[1] نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ صرف پنجاب میں لاکھوں روپے کے وقف کا سرکاری طور پر غلط استعمال کیا جاتا ہے +

[1] Leitner

حج کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ حاجیوں کو لیجانے کے انتظام کو باقاعدہ بنانے اور دوران سفر میں انکی حفاظت کی سخت ضرورت ہے۔ گزشتہ تین سال میں بہت کچھ اصلاح عمل میں آچکی ہے لیکن وہ بہت کم ہے اور ہندوستانی مسلمان اس قسم کی حفاظت کو امپیریل گورنمنٹ کا فرض منصبی خیال کرتے ہیں، بالخصوص اس وجہ سے کہ قرنطینہ اور جدہ کے تکلیف دہ قواعد کے باعث برائیاں روز بروز زیادتی پر ہیں +

تعلیم کے متعلق مسلمانوں کی پوزیشن حسب ذیل ہے :-

انگلستان کے کیتھولک باشندوں کے مانند انہیں اپنے مذہب سے بیحد شغف ہے اور وہ ہمیشہ اس کے لئے متفکر رہتے ہیں کہ جس برکت کے وہ حصہ دار ہیں وہ اپنی پاکیزہ حالت میں ان کے بچوں تک پہنچ جائے اور انکا خیال یہ ہے کہ جو دنیاوی تعلیم حکومت کی جانب سے دی جاتی ہے وہ ان ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہندوستان میں ایک استاد کو اپنے شاگرد سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں ملیگی۔ اور مسلمان یہ دیکھ رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں اساتذہ بالعموم یا تو انگریز ہیں یا ہندو کٹر مسلمان اسی وجہ سے علیحدہ رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں وہ ہر قسم کی سرکاری امداد سے محروم ہوگئے ہیں اور جو لوگ مذہب کی سختی سے پابندی کرتے ہیں وہ تمام سرکاری تعلیم سے غیر مستفید رہتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ یہ محض تعصب اور خواہ مخواہ کی مخالفت ہے۔ وہ غیر وفاداری کے باعث اس سے متمتع نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ ترقی کے خواہشمند نہیں ہیں۔ لیکن پہلے زمانہ میں خواہ کچھ ہی حالت کیوں نہ ہو میں وثوق کے ساتھ کہسکتا ہوں کہ اس بیان میں ذرا سی بھی صداقت نہیں ہے۔ ہندی مولویوں نے جو نقطۂ خیال قائم کیا ہے میرے خیال میں از روئے انصاف اس پر نکتہ چینی نہیں کیجاسکتی اور یہ بات دوسری ہے کہ اس نظریہ کو پیش کیا جائے کہ تمام مذاہب خراب ہیں لہذا حکومت کا فرض ہے کہ ان کی تعلیم کو کم کرے میں خیال نہیں کرسکتا کہ حکومت نے اس نظریہ پر اپنے طرز عمل کی بنیاد رکھی ہو مگر عملاً مسلمانوں کی تعلیم پر انکی پالیسی کا بیحد اثر پڑ رہا ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر امپیریل گورنمنٹ چاہے تو محافظ کی حیثیت سے دخل دے سکتی ہے۔ مسلمان اس کارروائی سے بیحد خوش ہوجائیں گے اور اسے اپنی وفاداری کے لئے باعث عزت قرار دیں گے +

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امپیریل گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کو پورے جوش کے ساتھ ہاتھ میں لے اور جہاں کہیں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہو وہاں اس کا خیال رکھے اُن کی تعلیم کی ترقی تجارتی اور صنعتی معاملات میں انکی ہمت ہمت افزائی اور بیرون ہند مقامات میں ان کے مذہبی مفاد کی وفادارانہ حفاظت وہ امور ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے مسلمان رعایا کو انگریزی تاج پر از سر نو اعتماد حاصل ہوجائیگا۔ ان کی جانب سے غفلت برتنا اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی موجودہ خراب پالیسی پر عملدرآمد رکھنا انہیں اس حد تک غیر وفادار بنا دیگا کہ پھر وہ وفادار نہ بن سکیں گے۔ اصلاح کا وقت ابھی باقی ہے اور اس لئے اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ بہت جلد وہ زمانہ آجائے جبکہ معاملہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے اسلئے کہ مسلمان اپنی تاریخ کے نازک ترین زمانہ میں سے گزر رہے ہیں اور انکی جائز شکایات کی طرف سے بے اعتنائی برتنے میں ہم گویا اُن

تسکین جاوید

کشمکش ہوں، جفا پروردہ ہوں، ناکام عشرت ہوں
میں اک بیگانۂ آرام ہوں محروم راحت ہوں
محبت نے مٹا رکھا ہے —— مجبور محبت ہوں
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

خلش آباد ہے گو میرے محسوسات کی دنیا
ہجوم بیکسی ہے اور مرے جذبات کی دنیا
یہ دنیا ہو گئی میرے لئے آفات کی دنیا
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

برہمن کو مری وحدت پرستی سے شکایت ہے
کلیسا کو مری عصمت پرستی سے شکایت ہے
تو شیخ کعبہ کو فطرت پرستی سے شکایت ہے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

نہ رفتار زمیں میری نہ دور آسماں میرا
سمجھتا ہوں کہ شاید ہو گیا دشمن جہاں میرا
دل آزاروں کے ہاتھوں لٹ رہا ہے کارواں میرا
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

ہلاک ذوق بھی ہوں نامراد جستجو بھی ہوں
فریب آرزو سے شرمسار آرزو بھی ہوں
چمن میں بھی ہوں اور محروم کیفِ رنگ و بو بھی ہوں
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

یہاں تک ہوش والوں نے بنایا مجھکو سودائی
کہ تیری بزم تک جانے لگی ہے میری رسوائی
مری فطرت پرستی کو کہا جاتا ہے "ہرجائی"
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

مری بربادیٔ قسمت کا ہر ذرہ ہے فریادی
مری مجبوریوں نے لوٹ لی ہے میری آزادی
ادہر دیکھوں تو بدبختی ادہر دیکھوں تو بربادی
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

میں گم گشتہ ہوں اور ہر رہنما بیزار ہے مجھسے
تلاطم اوج پر ہے ناخدا بیزار ہے مجھسے
زمیں ناراض ہے مجھسے فضا بیزار ہے مجھسے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

مری تخئیل ہے، بیکار تدبیروں سے وابستہ
مری تدبیر ہے، ناکام تاثیروں سے وابستہ
مری تاثیر ہے، قسمت کی زنجیروں سے وابستہ
مگر تو ہے تو کیا غم ہے

بنایا حسرتوں نے میرے دل کو اپنا گہوارہ
نہ وہ فردوس عشرت ہے نہ وہ خلد نشاط آرا
مری آنکھیں ہیں اور ناکامیوں کا تلخ نظارہ
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

عزائم مضمحل ہیں اور منزل دور ہے مجھسے
میں ہوں اک موجۂ آوارہ ساحل دور ہے مجھسے
قدم اُٹھتے نہیں اور تیری محفل دور ہے مجھسے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

روش صدیقی

دامنِ کوہ

کوہ کے دامن میں تھا اک روز میں محوِ خرام
کائناتِ دل ہوائے دہر سے پُر اضطراب

فطرتِ زرکار کی نیرنگیاں تھیں جلوہ زا
تھا چراغِ لالہ روشن اور نرگس محوِ خواب

شاخِ گلبن پردہ در دیدہ نگاہ چشمِ گل
ایسی تھی جیسے نکل آئے چمن میں ماہتاب

آبشاریں اس طرح وادی میں تھیں نغارہ سوز
جیسے پانی ہو کے بہ جائے شعاعِ آفتاب

قطرۂ شبنم درخشاں اس طرح تھے پھول پر
جس طرح تاریکیٔ شب میں چمکتا ہے شباب

برف تھی وقفِ روانی موج کے گہوارہ میں
کس قیامت کا سماں تھا یہ طلسمِ سیم و آب

یاسمن، ریحان، سوسن، ارغواں، درمونتیا
یہ تھے واں دیوانِ فطرت کے نظر افروز باب

دامنِ کہسار کا منظر تھا اتنا دل فریب
در دلِ نظارگی نے صبر ماندہ نے شکیب

غلام ربانی عزیزؔ

واردات

مکاں کماں خدنگِ کماں زمانہ ہوا
فلک کے جور کا دل جب کہیں نشانہ ہوا

عدم سے آئینہ بیتاب میں نہ تھا لیکن
پکڑ کے مجھکو یہی "خود نما" روانہ ہوا

الٰہی اس کی ہے بالیدگی قیامت کی!
بلند طوبیٰ و سدرہ سے بھی یہ دانہ ہوا

بلا کو ذوقِ نظر کیا ملا! بقولِ کسے
سمندِ تازکو اک اور تازیانہ ہوا

اسی نے چھیڑ دیا حسن و عشق کا قصہ
کہیں تو زلف بنا اور کہیں یہ شانہ ہوا

یہ شمع وہ ہے کہ ہے جسپہ مہر و ماہ کو رشک
کہ ایک اسکو عطا سوزِ جاودانہ ہوا

یہی وہ قطرۂ شبنم ہے اے امینِ حزیں
ٹپک کے جو گلِ ہستی پہ بیکرانہ ہوا

امین حزیںؔ

شاعر کا ترانہ

عجب اک عالم کیف و لطافت ہے مری دنیا
شفق کا رنگ ہے پھولوں کی نکہت ہے مری دنیا

مری اقلیم کی وسعت زمیں سے آسماں تک ہے
مرے تخئیل کی رفعت حدودِ لامکاں تک ہے

جو آنکھیں بند کر کے چشمِ باطن کھول کر دیکھوں
تو ہر ذرے میں صحرا ہر ستارے میں قمر دیکھوں

اگر چاہوں تو پروازِ تخئیل کی لطافت سے
نکل کر میں دکھا دوں عالمِ امکاں کی وسعت سے

کبھی جھیلوں سے دلچسپی کبھی دریا سے دلچسپی
کبھی خلوتکدوں میں ساغر و مینا سے دلچسپی

کبھی بے حاصلی میں روز و شب برباد ہوتا ہوں
کبھی بے کار ہنستا ہوں کبھی بے کار روتا ہوں

ربابِ دل سناتا ہوں پہاڑی آبشاروں کو
تخئیل کے پروں پر اڑ کے چھو آتا ہوں تاروں کو

میں اکثر رات کی تنہائیوں میں اٹھ کے روتا ہوں
نمِ گریہ کے آبِ گرم سے دامن بھگوتا ہوں

مرے کانوں میں شب کو وہ ندائے درد آتی ہے
جو سازِ دل کے ہر نغمے کو آ کر چھیڑ جاتی ہے

یہ وہ نغمے ہیں جن میں اک قیامت کا ترنم ہے
کہ معنے کچھ نہیں پھر بھی سماعت کیف میں گم ہے

غرض اک رازِ پنہاں ہے یہ سرشاری یہ سرمستی
کبھی پستی میں رفعت ہے بلندی میں کبھی پستی

مرے مانند دیکھا کر مناظر چشمِ حیرت سے
فضائے قلب کو لبریز کر وجدانِ فطرت سے

نوائے شوق سے بھرے ربابِ دل کے تاروں کو
نظر میں جذب کرے ساری دنیا کی بہاروں کو

حقائق سب عیاں ہو جائیں گے رندی و مستی کے
بلندی کی طرف لے جائیں گے جذبات پستی کے

(ذوقی)

خوشی اور غم

چمک اے برق ہاں اک بار پھر تو بادمِ تازہ
جھجک سے تیری، تاریکی کا ہو جاتا ہے اندازہ

نظر پر ہو گئیں قصرِ الم کی ظلمتیں روشن
خوشی کی اک جھلک کے واسطے کھلتے ہی دروازہ

حامد اللہ افسر بی اے

غزلیات

آزاد انصاری

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا کہ دم پر آبنی
ہائے جز اک اللہ اچھا لطف کا انداز تھا

ہم کسی سے بات کیا کرتے کہ شرم ضبط تھی
ہم کسی سے درد کیا کہتے کہ دل کا راز تھا

آپ کے الطاف کیا تھے جور کی تمہید تھی
آپ کی اُمید کیا تھی یاس کا پرداز تھا

تیرے انداز ستم بھی لطف سے خالی نہیں
برہمی کیا تھی کہ خاصا التفات ناز تھا

اکبر حیدری

یہ ستم۔ اک خواہش موہوم پر ؟
لطف فرما خاطر مغموم پر !

اے مسرت میرے غمخانے سے دور
یہ گرانی اور میرے معصوم پر ؟

پرسش حالات غم سے درگزر
رحم فرما اب دل مرحوم پر ؟

صبر کرتی ہی رہی بے چارگی
ظلم ہوتا ہی رہا مظلوم پر

اک تبسم تھا جواب آرزو
وسعتیں قرباں ہوئیں مفہوم پر

ابتدائے غم کی دور اندیشیاں
شاد ہوں انجام نامعلوم پر

آج تک اکبر ہوں میں ثابت قدم
جادۂ خود داری موہوم پر

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

یوں ہی نہ بھلا دے کوئی آئین وفا کے
کیا جاتے ملا کیا انہیں بیکس کو رلا کے

سب قتل کی حسرت ہی لئے مر گئے آخر
بے درد نے دیکھا بھی نہیں آنکھ اٹھا کے

عبرت ہی کو رہنے دو یہ ٹوٹی ہوئی قبریں
کیوں نقش مٹاتے ہو مزار شہدا کے

سر تھام کے بیٹھے تو جگر تھام کے اٹھے
اس دل نے اٹھایا یوہیں سو بار بٹھا کے

بے سود ہے آہ سحری اے دل صد چاک
پھولوں کو کوئی گوندھتا ہے رات بسا کے

سنتے تھے اثر کو کہ ہیں وہ عقل کے پتلے
لو آج چلے آتے ہیں دل مفت گنوا کے

تبسم نظامی

اس ضد کو کیوں مبالغہ دل کہا نہ جائے
قاتل اُسے کہوں جسے قاتل کہا نہ جائے

طوفانِ التجا ہو، جو روپوش تو رہے
اور حالِ زار تیرے مقابل کہا نہ جائے

اس درجہ آشنائے محبت بنا مجھے
نقش خیال کو مرے باطل کہا نہ جائے

مرنا بھی اس کے ہجر میں دشوار ہو گیا
اب موت کو بھی عشق کا حاصل کہا نہ جائے

وہ لطف چاہتا ہوں میں اسکی نگاہ سے
جس کی طلب کو درد کا حاصل کہا نہ جائے

کیا کیا کہا نہ جائے اُسے پیش آئینہ
دلکش کہا نہ جائے کہ قاتل کہا نہ جائے

ہو جائے وقف گریہ تبسم خدا کرے
دیوانۂ تبسم قاتل کہا نہ جائے

جگر بریلوی

وہ برق جلوہ کہاں اور کہاں یہ خرمن ہوش
سمجھ کے حالت دل ہو گیا کوئی روپوش

نگاہ ساقی مدہوش نے کر دیا بے ہوش
فضا میں گونج رہی ہے صدائے نوشا نوش

یہی ہے رمز محبت یہی ہے راز فنا
برنگ برق طپاں رہ برنگ باد خموش

ابھی تو شور قیامت لگی تھی آنکھ مری
جگا کے چھیڑ دیا پھر وہی فسانۂ دوش

کسی کا ذکر زباں تک ابھی نہ آیا تھا
بھڑک کے شمع صفت ہو گیا کوئی خاموش

وہ آگئی نزع کی ہچکی بدل گئی دنیا
مریض ہجر کہاں ہے ترا وہ جوش و خروش

جگر کو دیکھ کے اہل نظر یہ کہتے ہیں
جہان ساتھ لئے پھر رہا ہے خانہ بدوش

حافظ غازیپوری

صدائے بازگشت آتی نہ ہو یہ آرزو میری
خدا جانے سناتی ہے مجھے کیا گفتگو میری

جہاں سے دیکھتا ہوں میں فروغ منظر نظرت
صلائے ہوش دیتی ہے تمنائے نمو میری

عجب پرکیف دور نیم شب تھا یاد جاناں میں
کہ رقص حسن انجم بن گئی ہر آرزو میری

فضائے گل میں حب بکھرے نظر آئی تری جلوہ — فضائے رنگ و بو ہو ہو کر نکلی آرزو میری
گذر جا مست و بیخود سی بچا کر اپنے دامن کو — بھری ہے ساغرِ دل میں شراب تندخو میری

تلاشِ حسن میں مجکو ملا غم کا نشاں حافظ
فنائے عشق ہو کر کام آئی جستجو میری

کیفؔ مرادآبادی

دل پھر ہے ایک حشر تمنا لئے ہوئے — قطرہ ہے پھر کنار میں دریا لئے ہوئے
رسوائی خیال کی اللہ رے احتیاط — مدت ہوئی ہے نام تمھارا لئے ہوئے
میں اور تم سے ہر کرم و لطف کی امید — تم اور مجھ سے رنجش بیجا لئے ہوئے
اب دیکھتا ہوں کون رہیگا حجاب میں — میں جا رہا ہوں ذوق تماشائی ہوئے
میری نگاہ شوق کا یہ جوش دیکھنا — اُٹھے حریم ناز کا پردا لئے ہوئے

پھر چھیڑتا ہے تار رگ جاں کو کوئی کیفؔ
ہاتھوں میں ایک تیز سا دشنہ لئے ہوئے

کیفیؔ چریاکوٹی

بہ محشر آں ستمگر نزد تو یا رب چہ جا دارد — کہ از خون شہیداں شوخیش رنگیں قبا دارد
ز حسن و عشق چیزے با رقیباں کے تواں گفتن — نہ حسنش ابتدا دارد نہ عشقم انتہا دارد
نمی دانم کہ با چارہ گراں از خویش چوں سازم — دلم درد تو میدارد، اگر دارد بجا دارد
بگرداب بلا ہر کس بقدر ہمتش کوشد — حریفاں ناخدا دارند و دل یاد خدا دارد
بہ بخت عاشق بیتاب تدبیرے نمی گنجد — بنازم ہمت دل را کہ درد لا دوا دارد
ہمیدانم کہ جانِ ناتوانِ من بہ تن بالد — نمی دانم صبائے کوئے او با خود چہا دارد
بہ شست و شوئے طوفانِ سرشکم ہم بجا ماند — مگر داغ جبینِ من عجب رنگ وفا دارد
بہ فکر روزگارے اوست و دل را نیست پروائے — زشاہے، ایں گدائے بینوا شانے جدا دارد
دلم در سینہ و درد فراق تو بدل باشد — ببیں جانباز عاشق چوں بلا اندر بلا دارد
بہ سر سودا و در دل شوق و حسنش در نظر زیبد — اگر عاشق جز ایں دارد چہا دارد کجا دارد

منم چون شبنم و آں صورت مہر جہانتا بے
نگاہِ شوخ باید شکوۂ عاشق چرا دارد
بجانم می خرام و سوئے چشم جلوہ می افگن
کہ ایں شوقِ جدا واں لذت و لطفِ جدا دارد
زکیفی، دین و دل ہر دو فدایت ہیچ می پرسی
دو عالم را نمی خواہد کہ او شوقِ شما دارد

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "ظریف شاعروں کا تذکرہ"، نصف قیمت پر حاصل کر سکیں۔ یہ تذکرہ تقریباً ۴۰۰ صفحات پر شائع ہوگا اور اس کی قیمت (للعہ) چار روپیہ سے کم نہ ہوگی، لیکن اگر آپ نے اشاعت سے قبل دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدئے تو آپ اتنی ہی رقم میں اس کے پانے کے مستحق ہو جائیں گے۔ یہ تذکرہ اس قدر مکمل، دلچسپ اور نئی چیز ہے کہ زبان اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

سیکڑوں ظریف شاعروں کے حالات، ان کے لطائف و ظرائف اور ان کا بےمثل ظریفانہ کلام جو ہزاروں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی آپ کو نہیں نظر آسکتا، برسوں کی محنت و کاوش کے بعد ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے اور آپ اشاعت سے قبل اُسے صرف دو روپیہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اشاعت کے بعد پھر کوئی رعایت نہیں ہوگی۔ یہ کتاب سوائے ہمارے اور کہیں نہیں مل سکتی تھوک فروش ایجنٹ اور کتب فروش اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ورنہ اشاعت کے بعد ان کو زیادہ سے زیادہ (۲۰) فیصدی کمیشن ملیگا بغیر روپیہ وصول ہوئے کوئی آرڈر درج رجسٹر نہیں کیا جائے گا۔

منیجر نگار۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

تفتیش جاری ہے اور ہر چند ہمیں یہ سنکر حیرت ہوتی ہے کہ کائنات کے ایک ایک ذرہ میں پورا نظام شمسی پایا جاتا ہے۔ لیکن ہم انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں پاتے اور اگر کل کو کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ صرف ایک ذرہ کی مدد سے ساری دنیا کو ہلاک کر سکتاہے تو ہمیں اسپر بھی ایمان لانا پڑے گا، کیونکہ ہم لوگ جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ صرف سجود و نیاز کی دنیا ہے اطاعت و فروتنی کی فضا ہے، عجز و درماندگی کی سرزمین ہے اور ہم کو اُن کے مقابلہ میں چوں وچرا کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

ہمارے ہاں کے مولوی خواہ کتنے ہی برہم ہوں، لیکن اگر اُنھیں کبھی انگلستان یا فرانس جانا پڑا تو مسجد کی اذان اُنہیں مائکروفون اور لاسلکی مکبرۂ صوت ہی سے سننی پڑیگی اور اگران کی نسل منقطع نہ ہوگئی، تو حج بھی اسی طرح لاسلکی ہوا کریگا اور گھر بیٹھے عرفات ومنا کے میدان سامنے آجایا کریں گے۔

پھر اگر مذہب اور اہل مذہب موجودہ ارتقاء کا ساتھ نہیں دے سکتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں قابل الزام کون قرار دیا جائیگا؟ وہ جسنے گھر بیٹھے بغیر کسی زحمت کے لاسلکی حج کر لیا یا وہ جس نے مذہب کے حدود کو وسیع نہ کر کے تمام مہذب دنیا کیلئے اس کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

جاپان کی صحافت

اگر کسی قوم کی حالت کا صحیح اندازہ کرنا ہو، تو اس کی صحافت پر غور کرو جس سے تم کو ان کی فردی واجتماعی زندگی، ان کے عزائم وآمال اور ان کے اخلاق وعادات کا بخوبی علم ہو سکتا ہے۔ اس لئے تمدن جدید میں سب سے بڑی قوت جس سے کسی متنفس کو انکار نہیں ہو سکتا، صحافت کی قوت ہے۔

یورپ میں بلا استثناء تمام ممالک اس لحاظ سے بہت ترقی یافتہ ہیں اور ان میں جرائد ورسائل کی کثرت اب اس حد سے بڑھ گئی ہے کہ اس کا بار بار ذکر کیا جائے لیکن بدقسمت ایشیا میں صرف جاپان ہی ایک ایسا خوش نصیب ملک ہے۔ جو اس لحاظ سے ممالک یورپ کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت جاپان میں بعض اخبار ایسے ہیں جن کی اشاعت روزانہ بیس لاکھ ہے اور لطف یہ ہے کہ ان میں سوائے سیاسی، اقتصادی، علمی وادبی مضامین کے اور کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ یورپ کے اخبارات میں محض توسیع اشاعت کے لئے جرائم اور طلاق وغیرہ کے قصے بھی درج کئے جاتے ہیں۔

ان جرائد میں سے ایک جریدہ کی آمدنی بارہ ملین ڈالر (یعنی تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپیہ) سالانہ ہے جس میں خالص نفع ڈھائی ملین گنی ہوتا ہے۔ یہ سنکر ممکن ہے کسی کو شک پیدا ہو کیونکہ جاپان کی وسعت صرف امریکہ کے ایک صوبہ کالیفورنیا کے برابر ہے اور آبادی صرف ساڑھے چھ کروڑ ہے (حالانکہ اس کے مقابلہ میں امریکہ کی آبادی گیارہ کروڑ سے زیادہ ہے) لیکن یہ واقعہ ہے کہ آبادی اور وسعت کے لحاظ سے جاپان کی صحافت امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ وسیع وترقی یافتہ ہے

جاپان میں اس وقت ۱۱۴۷ روزانہ اخبار، ۲۴۵۰ ہفتہ وار اور ماہوار رسائل شائع ہوتے ہیں۔ اور روزانہ اخبارات کی مجموعی اشاعت دس کروڑ ہے۔ یعنی ہر چھ آدمی کے لئے ایک کاپی شائع ہوتی ہے۔ اس ترقی کا راز صرف وہاں کی وسعت

تعلیم ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مدارس ابتدائی سے فارغ ہونیوالے طلبہ ۹۱ فیصدی ثانوی مدارس میں جاتے ہیں اور جملہ مدارس کی تعداد وہاں ...۴۴ ہے جن میں ایک کروڑ ۵ لاکھ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔

وہاں مطالعۂ کتب کا شوق جسقدر بڑھا ہوا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۹۲۵ء میں ۱۰۰۸۲ کتابیں مختلف علوم وفنون کی شائع ہوئیں اور یوروپین ممالک کی کتابیں ۵ لاکھ گنی قیمت کی ملک میں آئیں۔

ابھی ہمنے ذکر کیا ہے کہ جاپان کے اخباروں کی اشاعت ایک کروڑ تک پہونچی ہوئی ہے اس کی تقریباً نصف اشاعت صرف اُن دس بڑے بڑے اخبارات کی ہے جو ٹوکیو اور اوساکا سے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک اخبار کی اشاعت ۱۳ لاکھ اور دوسرے کی ۸ لاکھ روزانہ ہے۔

چھ سال کا زمانہ ہوا کہ اوساکا کے اخبار نے نہایت عظیم الشان عمارت طیار کرائی جو پانچ منزل کی ہے اور جسپر ۲۵ لاکھ گنی صرف ہوئی، اسی طرح ٹوکیو کے اخبار نے ۳ لاکھ گنی صرف ایک عمارت اپنے لئے طیار کرائی۔ ٹوکیو اور اوساکا کے دونوں اخباروں کے درمیان خبریں وغیرہ لیجانے کے لئے ہر وقت پانچ ہوائی جہاز کام کرتے رہتے ہیں۔ ان اخباروں میں باہم مقابلہ بھی نہایت شدید ہے۔ اگر ایک اخبار شام کا اڈیشن مفت تقسیم کرتا ہے تو دوسرا بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ جاپان کے اخباروں کی ایک عجیب وغریب خصوصیت ان کے ضمیمے یا تتمے ہیں جو روزانہ تیرہ تیرہ شائع ہوتے ہیں اور ہر شہر کے لحاظ سے علحدہ ہوتے ہیں۔ یہ ضمیمہ ایک چھوٹا سا ورق ہوتا ہے اور اخبار بیچنے والے جب اس کو لیکر نکلتے ہیں تو یہ عالم ہوتا ہے گویا حشر برپا ہے اور ہر شخص اس بے صبری کے ساتھ اس کو لینا چاہتا ہے گویا وہ اندیشہ کرتا ہے کہ کہیں یہ دنیا تباہ ہو جائے اور میں اس خبر کے پڑھنے سے محروم رہوں۔

خبریں حاصل کرنے کے لئے یہ اخبارات بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کے زلزلۂ جاپان کی خبریں حاصل کرنے کے لئے اوساکا کے اخبار نے ۴۴ ہزار گنی صرف کی جلد سے جلد خبر حاصل کرنے کے لئے جو اہتمام کیا جاتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب ۱۹۲۶ء میں شاہ جاپان بستر مرگ پر تھا او ساکا اور ٹوکیو کے دونوں اخباری کمپنیوں نے قصر شاہی ہی کے قریب دو مکان کرایہ پر لئے اور وہاں اپنے اپنے مخبر متعین کئے تاکہ ہر لمحہ کی خبر جلد سے جلد مرکز تک پہونچائیں پھر اسی کے لئے نئے ٹیلیفون تصویر لینے کے کیمرے پیام رساں کبوتر، موٹر سائکل، ہوائی جہاز وغیرہ ہر وقت ہر مکان میں طیار رہتے تھے اور ساٹھ آدمی شب و روز جاگتے رہتے تھے۔

اوساکا کے اخبار میں ۲۶۵۴ آدمی کام کرتے ہیں، جن میں ۴۰۵ شعبۂ تحریر میں ہیں اور ۳۶۰ شعبۂ ادارت میں۔

امریکہ کی دولت گزشتہ سال امریکہ کی دولت وثروت اس حد تک پہونچ گئی کہ اس سے قبل تاریخ میں اس کا نظیر نہیں ملتا یعنی زمانۂ قدیم میں بھی کوئی سلطنت ایسی نہیں ہوئی جو اتنی بڑی ثروت کی مالک رہی ہو۔

اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا قرض اس وقت دوسرے ملکوں پر اس قدر ہے کہ اگر تمام دنیا کی سونے کی پیداوار کو سہ چند کر دیا جائے تو بھی قرض کی مقدار زاید ہوگی۔ اس وقت امریکہ کے بنکوں میں ایک ارب ۹۰ کروڑ گنی تو فقط

صورت سے پائی جاتی ہیں اور لکھ پتیوں کی تعداد وہاں گیارہ ہزار سے کم نہیں ہے۔ وہاں کی پبلک کے پاس دو کرور بیس لاکھ موٹریں اور ٹیلیفون اور آلات لاسلکی کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ اگر تمام دنیا کے ٹیلیفون اور آلات لاسلکی شمار کئے جائیں تو بھی امریکہ سے کم ہوں گے۔ تمام ملک میں ریل کا ایسا جال پھیلا ہوا ہے کہ تمام دنیا کی ریلوں سے ۳۷ فی صدی زیادہ ہے صرف وہاں کے سیّاح ہر سال ۱۳ کرور گنی صرف کرتے ہیں۔

صناعت و زراعت کے لحاظ سے بھی انکا تفوق ظاہر ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ آبادی میں وہ یورپ کے پانچویں حصہ سے زیادہ نہیں ہے۔ تمام دنیا کی زرعی و صناعی پیداوار میں نصف سے زیادہ انکا حصہ ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ۵۵ فیصدی رہا ۵۱ فیصدی تانبا ۶۲ فیصدی پیٹرول، ۴۳ فیصدی کوئلہ، ۵۲ فیصدی لکڑی، ۸۰ فیصدی گندھک اور ۵۵ فیصدی روئی اہل امریکہ نے پیدا کی۔ چنانچہ اسی دولت کا نتیجہ ہے کہ صرف ایک شہر نے ایک سال کے اندر سے ۵ لاکھ گنی گھوڑ دوڑ بازی کی تفریح میں صرف کر دئے اور یونیورسٹیوں پر ۶۰ ملین گنی کی جایداد انھوں نے وقف کر دی۔

سامنی عہ۸ر
سوانح عمرو عیار عہ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس عہ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

- دنالنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلھن ۱۲ر
- معشوقہ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۱۲ر
- رہ ہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی عہ
- سکینہ بنت حسین ۶ر
- ملکہ زنوبیہ ۳ر
- قرۃ العین ۳ر
- مخدرات عہ۸ر
- جویائے حق للعہ
- لعبت چین عہ
- فاتح مفتوح عہ۴ر
- بابک خرمی عہ۸ر

- الفانسو ۴ہ۲ر
- ایام عرب ۶ر۸ر
- قیس ولبنی عہ۴ر
- یوسف ونجمہ عہ۸ر
- زوال بغداد عہ۸ر
- مینا بازار عہ
- مقدس نازنین عہ۸ر
- رومتہ الکبریٰ عہ۸ر
- فلپانا عہ۸ر
- شوقین ملکہ عہ
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجیلنا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- حسن کا ڈاکو عہ۸ر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- غیب دان دلھن عہ
- بدرالنسا کی مصیبت ۳ر
- خوفناک محبت عہ۴ر
- میوۂ تلخ ۸ر
- نیکی کا پھل عہ

حکیم محمد علی مرحوم ہردوئی

- تیل کا سانپ عہ۹ر
- رام پیاری ۵ر
- عبرت سے۴ر
- حسن سرور للعہ
- اختر حسینہ ۶ر۸ر
- دیول دیوی عہ۹ر
- جعفر عباسہ عہ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق عہ۸ر
- قاسم وزہرہ عہ
- نیرنگ جمال ۴ر

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- زندانی ۶ر
- اصلاح زبان ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
- 〃 دوسری کتاب ۸ر
- 〃 تیسری ۸ر
- 〃 چوتھی ۸ر

میر ولی اللہ بی۔ اے

- بندگی ۶ر
- کاس الکرام سے
- لسان الغیب جلد اول سے
- 〃 دوم ۶ر
- 〃 سوم ۶ر
- 〃 چہارم ۶ر
- تمکدان فصاحت عہ
- بادۂ ناب عہ

ظفر عمر بی۔ اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری عہ۴ر

بہرام کی گرفتاری عہ

مولوی عبدالماجد بی اے

- فلسفۂ جذبات ۶ر
- مکالمات برکلے عہ
- پیام امن عہ۴ر
- تصوف اسلام عہ
- زود پشیمان ۸ر
- فلسفیانہ مضامین عہ

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن للعہ
- سیرۃ عائشہ سے
- حیات امام مالک عہ
- خلافت عثمانیہ عہ
- خلافت اور ہندوستان ۸ر

مولوی عبدالسلام ندوی

- اسوۂ صحابہ دو جلد سے
- سیرۃ عمر بن العزیز عہ
- انقلاب الامم ۶ر
- تاریخ الحرمین ۶ر
- فقرائے اسلام عہ
- فطرت نسوانی عہ
- شعر الہند دو جلد سے

مولوی سعید انصاری

- سیر الصحابہ جلد اول ۵ر
- 〃 دوم سے
- سیر الصحابیات ۶ر۴ر

مولوی عبدالباری ندوی

- مبادی علم انسانی عہ
- برکلے کا فلسفہ عہ

مولوی عبدالرزاق ندوی

- اسوۂ حسنہ ۶ر
- کتاب الوسیلہ ۶ر
- ترکی ویورپ ۶ر

مولوی نیاز فتحپوری

- گلستان جلی ۶ر
- گہوارۂ تمدن ۶ر
- نگارستان ۶ر
- صحابیات ۶ر
- تاریخ الدولتین عہ

سید سجاد حیدر بی اے

- زہرا ۱۳ر
- جلال الدین خوارزم شاہ عہ
- خیالستان عہ
- ثالث بخیر ۸ر
- حکایات واحتساسات عہ

مولوی راشد الخیری

- صبح زندگی عہ
- شام زندگی عہ
- شب زندگی ۶ر
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- منازل السائرہ ۶ر

- بنت الوقت ۸ر
- قطرات اشک عہ۸ر
- عروس کربلا عہ
- یاسمین شام عہ
- تیغ کمال عہ
- ماہ عجم عہ
- محبوب خداوند عہ
- موؤدہ ۸ر

مولانا حالی مرحوم

- مقدمہ شعر و شاعری عہ
- دیوان حالی عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

- سرابا قلپتن ۸ر
- بالشوک شہزادی ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- ممتاز بیگم ۸ر
- شعلۂ رنگین ۸ر
- محاصرۂ پیرس عہ
- شیخ چلی عہ
- بہادر ترک ۸ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس عہ
- حسن بنارس ۸ر
- فطرتی جاسوس عہ
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۸ر
- بہرام چور عہ
- زرپرست عہ

کبھی کا راز
عبدالرحمن ناصر
عروس مصر
سیلاب خون
کرشمہ
وفادار دلہن
طواف زمین
سیاحت زمین
سیاحت ہوا
نازنین مراکش
سمندر کی سیر
اسرار بالشوزم
روح لیلی
امین بک
حجاج بن یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
نیلی چھتری
بہرام کی آزادی
بہرام کی گرفتاری
بہرام کی سرگزشت
پراسرار قتل

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب
بزم خیال
مشاطۂ سخن
انشاء للنسوان
مکاتیب محسن الملک
لیلی مجنون ڈراما

مثنوی قاسم وزہرہ
فسانۂ جوش

تاریخی کتابیں

تاریخ اندلس
تاریخ عرب
اسرار رنگون
شباب لکھنؤ
مرقع اودھ
ارض بہرین
تفریح الاذکیا
تاریخ حبیب الہ
مراۃ الکونین
البدر
قصص الانبیا
صمصام الاسلام
فتوح الشام
تذکرۃ الکرام
منہاج النبوۃ
حیات العلماء
مذاہب الاسلام
روضۃ الصفا
تاریخ اودھ
خواتین رنگون
سیر المتاخرین
اعمالنامہ روس
تاریخ مصر

سلاطین اودھ
صحیفۂ زرین
تاریخ دربار
تاریخ ایران

تصوف و اخلاق

سیر الطیبات
علم الاخلاق
خدا کی ہستی
نابینا علماء
مختارات صوفیہ
حیات ابدی
افراد کاسبہ
عوارف المعارف
بوستان معرفت ۵ جلد
شجرۂ معرفت

مراثی

مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی ضمیر
مراثی مونس
مراثی دلگیر

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی
گلشن بیخار

سراپائے سخن
سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی
دیوان حافظ
دیوان نعمت خان عالی
کلیات انوری
دیوان بیدل
کلیات سعدی
دیوان عرفی
کلیات جامی
کلیات غالب
کلیات صائب
کلیات حزین
دیوان عنصری
دیوان ظہیر فاریابی
دیوان غنی کشمیری
دیوان ناصر علی
دیوان ہلالی
کلیات جلال اسیر

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی
کلیات ظفر
کلیات مومن

دیوان ناسخ
کلیات میر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبرآبادی
گلزار داغ
دیوان رند
دیوان ذوق
کلیات اسمعیل
مراۃ الغیب
صنمخانۂ عشق
فریاد داغ
دیوان قاتل
دیوان شہیدی

فن شعر و عروض

زر کامل العیار
ترجمہ حقائق البلاغت
عروض سیفی
شجرۃ العروض

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات مع تصاویر رنگین
با تصویر سادہ
مجمع الفنون
طلسم فرنگ
کارخانۂ عالم

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الدوین ولیلی
فریب حسن
سوز عشق
روز الیمرٹ
ناول اسرار
شام جوانی
طلسمی فانوس

زنانہ کتب خانہ

شوکت آرا بیگم
درس حمایت
خاتون جنت
بیوی کی تربیت
بہشتی زیور ۱۰ حصے
بہشتی گوہر
اقبال دلہن
حسن معاشرت
جواہر ریزے
عورتوں کی انشاء
بیوی کی تعلیم
تربیت اطفال
اصلاح معیشت
شمع ہدایت
اصلاح الرسوم
جہان آرا بیگم
بچوں کی پرورش
آرسی مصحف
ترغیب روزگار

نگار بک ایجنسی نظیرآباد لکھنؤ

نیاز فتحپوری

قواعد رسالہ نگار

۱ ۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے
۲ ۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
۳ ۔ خط وکتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جنپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کردیے جاتے ہین
۴ ۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ ۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین ۔
۶ ۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ ۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخنامہ اجرت اشتہارات	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
چھہ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	(۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہی	ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ — جلد ۱۳ شمارہ ۶

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہر ہندوستان سے باہر علاوہ محصول معہر

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۳ جون سنہ ۱۹۲۸ء شمار ۶

ملاحظات

اس رسالہ کے ساتھ تیرھویں جلد نگار کی ختم ہوتی ہے ہر چند رسائل کے باب میں آغاز و انجام کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ کسی جلد کا ختم ہونا کسی منزل تک پہونچنا تو ہے نہیں کہ ٹھہر کر ذرا دم لے لیا جائے، لیکن بعض حضرات چونکہ درمیان سے رسالہ کا مطالعہ پسند نہیں کرتے اس لئے اُن کی اطلاع کے لئے یہ لکھنا ضروری تھا۔

نگار کی گزشتہ جلد میں تنقیدی مضامین زیادہ شائع ہوئے اور چونکہ تنقید ہمیشہ تعلقات کو ناخوشگوار بنا دیتی ہے، اسلئے حیرت کی بات نہیں اگر بعض لوگوں کو شکایتیں پیدا ہوگئی ہوں۔ لیکن اس کا تکلیف دہ منظر اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہ کہ نگار کی اس روش کو فرقہ وارانہ سمجھکر مجھپر یہ الزام قائم کیا گیا کہ میں شیعہ شعراء و مصنفین کی تنقیص کے لئے ایک خاص پروپگنڈا کر رہا ہوں اور ایک مخفی جماعت اس مقصود کے لئے ترتیب دے رہا ہوں ۔ اتنے بڑے الزام کے ثبوت میں ایک مضمون تو وہ پیش کیا جاتا ہے جو غالب کے متعلق شائع ہو چکا ہے اور دوسرا آبجیات کی تنقید کا اور ممکن ہو اسی سلسلہ میں میرے اس نوٹ کو بھی شامل کر لیا جائے جو علی عباس حسینی کے ایک فسانہ پر شائع ہوا تھا۔ اور اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جلئے کہ دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے، تو نگار کے مومن نمبر کو بھی فہرست دلائل میں شامل کر لیجئے الغرض تمام وضعی و غیر وضعی دلایل جو میری عصبیت کے ثبوت میں

پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ اور اس قدر ہیں۔ میں اس کو بھی تنگ نظری سمجھتا ہوں کہ اس نوع کی تنک ظرفیوں کی طرف توجہ کروں، لیکن چونکہ میرے حلقۂ احباب میں شیعہ حضرات کی بھی کافی جماعت ہے، اور ان میں سے میں بعض کے خلوص و محبت کے لئے میں نہایت حریص ہوں، اس لئے اس قدر اظہار ضروری خیال کیا گیا۔

بہر حال مجھے اپنی صفائی میں زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو شخص مذہب کے باب میں اس قدر آزاد ہو کہ اعتقادات میں محض توحید اور عبادات میں صرف تصفیۂ اخلاق کو اسلام کے لئے ضروری خیال کرتا ہو اور جو مسلک و مذہب کی تفریق کو پوری طرح سمجھتا ہو، اس پر یہ الزام قائم کرنا کہ وہ تشیع و تسنن کے فرق کو پیش نظر رکھکر ادبی تنقید کرتا ہے، اتنا بڑا گناہ ہے کہ "لا یقاس بہ ذنب"

بہر حال جو بات میرے نزدیک حق ہے اس کا اعلان ہمیشہ کرونگا، خواہ اس کے جواب دینے میں کوئی شخص کتنی ہی سخت غلطی میں کیوں نہ مبتلا ہو جائے۔

تذکرۂ آبحیات پر تنقیدی مضمون اس مہینے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کی کامیابی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی نصف ہی مضمون شایع ہوا تھا کہ لوگوں میں بےچینی پیدا ہو گئی ——— اور سب و شتم کا نام جواب رکھ کر ایک مختص الجماعت پرچہ میں اُسے شائع کر دیا گیا۔ چونکہ جواب میں اصل اعتراضات سے اعراض کر کے صرف آبحیات کے انشا کی تعریف میں زور قلم صرف کیا گیا ہے اس لئے لازم آیا کہ اب منشی محمد حسین آزاد کے معجزات ادب پر بھی روشنی ڈالی جائے اور بتایا جائے کہ آزاد کے جن مخصوص کارناموں کو وہ اس قدر "چمکتا ہوا" بتاتے ہیں، حقیقتاً "سونا" وہ بھی نہیں ہیں۔ آئندہ اشاعت کا انتظار کیا جائے۔

ایک فلسفی کا انجام والٹیر، فرانس کے مشہور فسانہ نگار کے ایک فسانہ کا ترجمہ ہے جو عربی سے لیا گیا ہے

دیوان یقین پر جناب سید محی الدین قادری زور کا مقالہ قیمتی چیز ہے۔ جناب اعظم کریوی نے اپنے فسانہ نگار میں اپنی مخصوص مدعا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ نقد الشعر سلسلہ کا مضمون ہے اور از بس کار آمد۔ ڈرامے کا ایک سین جناب احسن لکھنوی کا عطیہ ہے جو فن ڈرامہ نگاری میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ فلسفۂ مذہب کا سلسلہ جاری ہے اور ابھی رہیگا۔ لارڈ رپن کا عہد حکومت اس نمبر میں ختم ہو گیا۔ مسٹر بلنٹ کی جس کتاب کا یہ ترجمہ ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتی ہے اور ہر چند اس کا ترجمہ اب اتنے زمانہ کے بعد شائع ہونا کوئی برمحل امر تو نہیں ہے، لیکن "کبھی نہ ہونے سے دیر میں ہو جانا ہی" غنیمت ہے۔ روپیہ کی شرح مبادلہ پر ابو المنصور حمید کا مضمون مختصر ہے لیکن عام پبلک کے لئے ابھی ایسے ہی مبادیاتی مضامین کی ضرورت ہے۔ ڈائری کا ایک ورق ایک اور دلچسپ افسانہ کا آغاز کرتا ہے جو غالباً ماہ آئندہ میں ختم ہوگا۔ باب الاستفسار میں ایک ایسے مسئلہ کا آغاز ہوا ہے جو غالباً کئی ماہ تک جاری رہیگا۔

منظومات میں جناب حافظ غازیپوری کی نظم بہت کچھ کیفیات کی حامل ہے، کاش اس میں عاشقانہ عجز و نیاز کی سادگی بھی ہوتی
روش صدیقی کی نظم پرستش خیال بھی ولولۂ شباب کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے لیکن اسمیں تخلیقی رنگ کی کمی ہے
امین حزین کی نظم جو اسباب مخاصمت کی غیر شاعرانہ عنوان سے شائع ہوئی ہے، خوب ہے۔ اور ان کے پیغام شاعری کو بہت نمایاں طور پر ظاہر کر رہی ہے۔ نظیر لودھیانوی کے "حسیات" اس رنگ سے جدا نہیں ہیں جو اُن کی طبیعت کی خصوصیت ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ کچھ دن سے ان کے اشعار میں "تاثرات عشق" زیادہ پائے جانے لگے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کو کوئی درس دیں خود اپنی جراحت کا اعلان زیادہ کرتے ہیں۔
غزلوں کے بھی بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں۔

تذکرۂ ظرفا کے متعلق جو اعلان منیجر کی طرف سے شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق ممکن ہے کہ بعض حضرات کو غلط فہمی پیدا ہو جائے اس لئے میں ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ تذکرہ مکمل ہو چکا ہے، کتابت شروع ہو گئی ہے اور جلد سے جلد اس کو شائع کر دیا جائے گا لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جلد سے جلد کے معنی بھی یہ تھو پریس کی دنیا میں مہینوں ہوا کرتے ہیں، اس لئے جو حضرات پیشگی روپیہ روانہ کریں وہ یہ سمجھکر بھیجیں کہ ابھی کئی مہینے تک اُن کو تذکرہ کا انتظار کرنا پڑیگا۔ بہر حال اگر وہ چند ماہ کا انتظار کر سکتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ اسوقت دو روپیہ بھیجدینے سے اُن کو ایسی کتاب ملیگی جو بعد تکمیل کسیطرح چار پانچ روپیہ سے کم میں فروخت نہ ہوگی۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں مدیر سچ (جناب عبدالماجد صاحب دریابادی) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اسپر آخرکار اخبار سچ مورخہ ۱۸ رمئی ۱۹۲۸ء میں ۱½ کالم کا ایک نوٹ شائع ہو ہی گیا ہر چند کہ "ادھر جناب عبدالماجد صاحب" رسالہ نگار کی زیارت سے علی العموم محروم رہتے ہیں" اور ادھر میں "اخبار سچ کی زیارت سے علی الخصوص محروم رہتا ہوں" لیکن پھر بھی رسالہ نگار کو انھوں نے اور سچ کو میں نے دیکھا اور اس طرح بحمداللہ آخرکار "کفر و اسلام" کا تصادم ہو ہی گیا۔

حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

فاضل مدیر نے جس لطف کے ساتھ میرے کفر و الحاد، میری ضلالت و گمراہی کا ذکر فرمایا ہے، اس کی داد اس دنیا میں تو نہیں مل نہیں سکتی اور عاقبت کی خبر خدا جانے صاحب موصوف نے کنایۃً اس سے بھی انکار کیا ہے کہ وہ خواجہ حسن نظامی کے مضمون فرام قبلہ تو شملہ سے متاثر ہوئے ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو کیونکہ میں نے بھی محض سماعت کی بنا پر لکھا تھا۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو بظاہر کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ فلسفی شاہ کا لقب بھی بہرحال ان کو اسی دربار سے ملا تھا جسے خاموشی سے قبول کر لیا گیا۔

نیاز

ساری میراث سے مجھے محروم کر دیا ہے، اسی کے ساتھ وہ مجھے سخت جسمانی عذاب میں مبتلا کرتا ہے، حتیٰ کہ میں جان سے بیزار ہو گئی ہوں اور سوائے اس کے کوئی چارۂ کار سمجھ میں نہیں آتا کہ خودکشی کر لوں۔ آپ بہت ذی فہم انسان معلوم ہوتے ہیں اگر تکلیف نہ ہو تو زحمت کر کے گھر تک چلئے اور میرا سارا قصہ تفصیل سے سنئے، ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں"

ممنون اسپر راضی ہو گیا اور کوئی وجہ راضی نہ ہونیکی نہ تھی۔ جب یہ گھر پہونچے تو ممنون کو وہ ایک نہایت آراستہ کمرے میں لے گئی اور تخت پر بٹھا کر انتہائی حسن تاثیر کے ساتھ اپنا حال بیان کرنا شروع کیا، وہ روتی جاتی تھی اور حال بیان کر رہی تھی، حال بیان کرتی جاتی تھی اور اپنا سحر گفتگو بھی پوری طرح صرف کر رہی تھی۔ ممنون نہایت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اس کی دلکش اداؤں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور نا معلوم طور پر دونوں میں فصل مکانی کم ہوتا جاتا تھا۔ ٹھیک یہی وقت تھا کہ دفعتہً دروازہ کھول کر لڑکی کا چچا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرہ سے انتہائی غیظ و غضب ٹپک رہا تھا۔ لڑکی تو یہ دیکھکر بھاگ گئی اور ممنون مبہوت و متحیر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ یہ موقعہ ایسا نہ تھا کہ ممنون اپنے فلسفہ کی مدد سے نجات حاصل کر سکتا، اسلئے مجبوراً اس کو اپنی جان و آبرو بچانے کے لئے جو کچھ اُس کے پاس موجود تھا، لڑکی کے چچا کے حوالہ کر دینا پڑا۔

ممنون نہایت محجوب و شرمندہ حالت میں گھر واپس آکر پڑا ہوا تھا کہ اس کے بعض احباب کی طرف سے دعوت طعام کا رقعہ آیا۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ "اگر میں گھر میں تنہا رہوں گا تو انکار کا اور زیادہ ہجوم ہوگا۔ کھانے کی بھی خواہش نہ ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ صحت پر خراب اثر پڑیگا، اس لئے چلنا ہی مناسب ہے ممکن ہے اُن کی باتوں میں جی بہل جائے" چنانچہ وہ یہ سوچکر دعوت میں شریک ہوا اور وہاں احباب نے اس کے چہرہ پر آثار ملال دیکھ کر شراب پینے پر اصرار کیا۔ ممنون نے دل میں سوچا کہ "تھوڑی سی شراب جس سے یہ ملال دور ہو جائے چنداں مضر نہیں ہو سکتی بلکہ مفید ہوگی" اس لئے اُس نے اول اول چند جرعے پئے اور پھر آہستہ آہستہ جب احساس کند ہونے لگا تو اور زیادہ پینے کی خواہش ہوئی یہاں تک کہ پورا نشہ اس پر مستولی ہو گیا۔ عشاء کے بعد جب دوستوں نے جوا کھیلنے کی ترغیب دی تو اُس نے پھر یہ سوچکر کہ "احباب کے ساتھ اس قسم کے مشاغل تفریحی بُرے نہیں ہوتے" جوا بھی کھیلا اور اس حد تک کہ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ ہارا اور اس سے چہار چند کا قرض ہو گیا۔ اس کے بعد کسی بات میں نزاع پیدا ہوئی اور اس جھگڑے میں ایک شخص نے ایسی سخت ضرب اس کے چہرہ پر لگائی کہ ایک آنکھ پھوٹ گئی ـــ اب یہ گھر واپس آیا لیکن اس حال میں کہ جو کچھ مال اس کے پاس تھا وہ ندارد ہو چکا تھا اس کا چوگنا قرض ہو گیا تھا اور ایک آنکھ بھی غائب ہو چکی تھی۔

دوسرے دن صبح کو اس نے اپنا خادم شاہی خزانچی کے پاس بھیجکر کچھ روپیہ طلب کیا تاکہ رات کا قرض ادا کرے لیکن خادم نے واپس آکر مطلع کیا کہ اُس نے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے، اور اب ایک پیسہ بھی ملنے کی اُمید نہیں۔ یہ سنکر ممنون نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو وہ اُٹھا اور آنکھ پر پٹی باندھ کر قصر شاہی کی طرف روانہ ہوا تاکہ اس سے فریاد کرے اور شاہی خزانچی کے مکر و فریب کا حال بیان کرے۔

قصر شاہی میں پہونچا تو یہاں بہت سی عورتیں امرا کی نظر آئیں جنہیں سے بعض اُس کو جانتی تھیں اور انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ "ممنون تمہاری آنکھ کیونکر جاتی رہی" اس سوال سے اس کا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا، لیکن مجبوراً خاموش رہا اور کسی نہ کسی طرح قصر شاہی کے قریب پہونچکر زمین بوس ہوا اور درخواست پیش کی۔ بادشاہ نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ درخواست لیلے اور مضمون سے اطلاع دے۔ سکریٹری درخواست پڑھکر ممنون کو علحدہ لے گیا اور بولا کہ "تو مجھے کوئی بیوقوف مسخرا معلوم ہوتا ہے ورنہ بغیر میری وساطت کے درخواست براہ راست بادشاہ کے سامنے پیش کرنا کیا معنے رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ تو نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کس شخص کی شکایت کر رہا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ میرا چچازاد بھائی ہے اور میری حمایت اسے حاصل ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ اس دعوے کو بھلا دو اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جاؤ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری دوسری آنکھ سلامت رہے۔"

ممنون نے عہد کیا تھا کہ وہ محبت نہ کرے گا، مسکرات سے احتراز کریگا، جوا نہ کھیلیگا جو بنیاد ہے فساد کی اور امن و راحت کی زندگی بسر کریگا، لیکن چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے تھے، کہ ایک ایک کرکے اس کے تمام عہد باطل ہوگئے اور وہ ایک بدترین انسان کی حیثیت سے اپنے مکان کی طرف واپس آیا۔ جب یہاں پہونچا تو معلوم ہوا کہ عدالت کے لوگ اس کے گھر کی چیزوں کو باہر نکال کر نیلام کر رہے ہیں اور ممنون کے احباب جن سے اس نے قمار بازی میں قرض لیا تھا وہاں موجود ہیں اور اپنے روپیہ کو اس طرح وصول کر رہے ہیں۔ یہ دیکھکر اس کو اس قدر سخت صدمہ ہوا کہ وہیں ایک درخت کے نیچے سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر میں اُس خوبصورت لڑکی کو اپنے چچا کے ساتھ ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ جب ان دونوں نے ممنون کو اس حال میں دیکھا تو قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔ غروب آفتاب کے بعد ممنون گھاس کے فرش پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور نہایت شدید تپ میں مبتلا ہوکر غافل سا ہوگیا۔ اس نے خواب میں ایک فرشتہ دیکھا جس کے نور سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں اور جس کے چھ حسین پر تھے۔ ممنون نے اس سے دریافت کیا "تم کون ہو"

—— "تیرا محافظ فرشتہ"

—— "تو پھر مجھ پر رحم کرو اور میری کھوئی ہوئی آنکھ، صحت، دولت اور عقل واپس دلادو"

—— "ہم اپنی دنیا میں ان حادثات سے دوچار نہیں ہوتے"

—— "اے متبرک روح، تیرا قیام کہاں رہتا ہے؟"

—— "بہت دور، کرۂ آفتاب سے ایک ارب پچاس کروڑ میل کے فاصلہ پر، ایک نہایت چھوٹے سے ستارہ میں"

—— "کیسا مبارک ہے تمہارا وطن کہ نہ وہاں مکر و فریب میں مبتلا کرنے والی لڑکیاں ہیں، نہ جھوٹے دوست جو مال بھی چھین لیں اور آنکھ بھی پھوڑ دیں، نہ خائن لوگ ہیں کہ دیوالہ نکال کر دوسروں کا مال ہضم کر جائیں اور نہ ایسے حاکم جو عدل و

والضاف طلب کرنے پر بُری طرح نکالدیں"

——"خدا کا شکر ہے کہ یہ باتیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے ہمارے ہاں نہیں ہیں۔ ہم عورت کی محبت کی طرف سے بھی محفوظ ہیں کیونکہ ان کی آنکھوں میں ہمارے لئے کوئی اثر نہیں ہے، نہ کھانے پینے کی افراط ہوسکتی ہے کیونکہ ہم کھاتے پیتے ہی نہیں نہ ہمیں مفلس ہونے کا ڈر ہے کیونکہ وہاں سونے چاندی کا وجود نہیں، نہ آنکھوں کے جانے کا ڈر ہے کیونکہ ہمارے جسم ہی نہیں ہے اور نہ ظلم وجور کا اندیشہ ہے کیونکہ سب مساوی درجہ رکھتے ہیں"

——"لیکن اے محترم فرشتے، آپ اپنا وقت کس طرح بسر کرتے ہوں گے جبکہ آپ عورت کی معاشرت اور کھانے پینے کی چیزوں سے محروم ہیں"

——"ہمارا وقت ان لوگوں کی امداد میں بسر ہوتا ہے جو ہماری حفاظت میں دئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت میں تمہاری ہمدردی کے لئے آیا ہوں"

——"افسوس، آپ کل کیوں نہ آئے کہ یہ مصائب مجھ پر نہ پڑتے"

——"کل میں ایک تیرے دوسرے بھائی کی خدمت میں مشغول رہا جو شاہ ہندوستان کے پاس ملازم تھا اور وہ تجھ سے زیادہ مستحق اعانت تھا کیونکہ بادشاہ نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوالی ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے زندان میں ڈالدیا ہے۔ بہرحال اب میں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔ تمہاری آنکھ تو البتہ واپس نہیں ملسکتی، لیکن اور تکلیفیں رفتہ رفتہ ضرور زائل ہو جائیں گی۔ اگر تم نے پھر کبھی فلسفی بننے کا قصد نہ کیا"

——"تو کیا فلسفی بننا اس قدر دشوار ہے؟"

——"ہاں، یہ ایسا ہی دشوار ہے جیسے حکمت وقوت، قدرت وسعادت میں کمال حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ تمام کُرے جو فضا میں نظر آتے ہیں اور جن کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے، یہاں ہر چیز تدریج کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ اور تم بھی اصلح وافضل تدریج ہی کے ساتھ ہو سکتے ہو"

یہ سنکر ممنون نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا کہ "ہاں ہوگا، لیکن میں تو اس وقت تک اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ جب تک میری کھوئی ہوئی آنکھ نہ مل جائے"

نیاز

ضرورت ہے

دیوان یقین

(مخطوطہ - انڈیا آفس - کتب خانہ لندن)

انعام اللہ خاں "یقین" اظہر الدین خاں دہلوی کے فرزند، مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد اور مخلص ارادتمند، اردو شاعری کے اُس دور کے غزلگو ہیں جس کے متعلق بہت سے امور ابھی تحقیق طلب ہیں اس دور کے شعرا کے حالات اور ان کا کلام اب تک پردہ ہی میں ہے اور شاید سوائے حاتم اور یقین کے دیوانوں کے فی الحال کسی اور کلام کی موجودگی کا عام طور پر علم بھی نہیں۔

یقین کی وفات کے متعلق تذکروں میں عجیب طرح کے فسانوی قصے درج ہیں۔ اگرچہ ہمارے اس مضمون کا مقصد یقین کے حالات زندگی سے بحث کرنا ہرگز نہیں ہے، تاہم ——— ابراہیم خاں کے تذکرہ گلزار ابراہیم (مخطوطہ برٹش میوزیم) کے مندرجہ ذیل الفاظ کا اظہار نامناسب نہ سمجھا جائے گا کیونکہ اس سے مرزا علی لطف کے تذکرۂ گلشن ہند کے اُن مبہم الفاظ کی وضاحت ہو جاتی ہے جو یقین کے متعلق علی ابراہیم کے انہی الفاظ کا ترجمہ ہیں اور علی لطف کے اور بہت سے ترجموں کی طرح شخص زیر بحث کے متعلق اکثر شبہات پیدا کر دیتے ہیں۔

اس منقولہ عبارت سے یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اردو میں مقفیٰ ترجمہ کرنے کی خاطر علی لطف نے علی ابراہیم کی سادہ سے سادہ عبارتوں کو کس مشکل اور پیچ در پیچ طریقوں سے پیش کیا ہے۔

پہلے علی لطف کی عبارت کو ہم ذیل میں بالکل انہی علامتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو اُن کے مقفیٰ جملوں اور فقروں کو جدا جدا کرنے کی خاطر تذکرہ گلشن ہند (مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۸۵) میں لکھی گئی ہے۔

"مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے، کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے باپ نے اسکے اس کو قتل کیا، اور نعش کو اس کی دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عمل شنیع کا گزرا تھا۔ اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں اکثر متنبہ کیا۔ ایک دن اس نے خفا ہو کر اس بیچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا ہی کو ہے۔"

علی ابراہیم خاں کے اصل الفاظ (از مخطوطہ برٹش میوزیم ورق ۲۵۲-ب اور ۲۵۳-الف) اس امر سے متعلق یہ ہیں۔

"گویند بعہد احمد شاہ بادشاہ بنا بر امر نا ملایمی کہ از یقین صادر می شد او را پدرش کشتہ بدریا انداخت و بعضے گویند پدرش ارتکاب امرے داشت کہ ممنوع

جمیع ادیان بود ———— او منع مینمود پدرش برآشفت وخونش بریخت"

———— -:(☆):- ————

یقین کے کلام کے متعلق ان کے معاصرین میں ایک خیال یہ پھیل گیا تھا جیسا کہ بعض تذکروں سے ظاہر ہے، کہ دراصل مرزا جان جاناں اُن کے نام سے شعر کہا کرتے تھے۔ لیکن یہ ایک مضحکہ خیز سی بات ہے۔ اگرچہ ایک سو سال پیشتر بھی اس سے انکار کیا جا چکا ہے لیکن اب خود یقین کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد کم از کم مجھے تو یقین ہو گیا ہے کہ یقین کے معاصرین نے غالباً حسد سے اس قسم کی افواہ مشہور کر دی تھی۔ وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ یقین جیسے نوجوان سے اس درجہ کا کلام غیر متوقع نظر آتا ہے۔ علاوہ اس کے تذکرۂ گردیزی کے دیکھنے سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ تذکرۂ گردیزی اس وقت تک طبع نہیں ہوا برٹش میوزیم میں اس کا قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا ہے اور اس نے یقین کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، اس سے یہ الزام بالکل رفع ہو جاتا ہے۔ فتح علی حسینی گردیزی میر کی طرح یقین کا آشنا سا ہے اور یقین ہی کی زندگی میں اُس نے یہ تذکرہ لکھا تھا۔ یقین کے متعلق گردیزی کے خیالات ملاحظہ ہوں:—

"صاحب تلاش معانی رنگیں انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خان بہادر مبارک جنگ، نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی است، ونواسۂ نواب حمید الدین خاں مرحوم۔ تہباز خیالش بصید معنی بلند پرواز است۔ وہمای اندیشہ اشں برقاف سخن بہ پر افشانی ممتاز۔ لی اعراف (؟) ریختہ گوئی را برطاق بلند گزاشتہ وتخم معنی درزمین کاشتہ۔ وآنچہ از طبعش سر زدہ از فرط شیوع وحسن قبول درتمام ہندوستان برافواہ والسنہ جاری است۔ استفادہ سخن از افادہ میرزا جان جاناں مظہر گرفتہ چنانچہ گوید شعر

جون نماز اپنے پہ صبح وشام لازم کر یقین　　حضرت استاد یعنے شاہ مظہر کی ثنا

با مولف اخلاص دارد۔ واکثر ہا بملاقات بہ دارد" (ورق ۵۷، مخطوطہ تذکرہ گردیزی - برٹش میوزیم)

معلوم ہوتا ہے کہ یقین اسی زمانہ میں مشہور بھی ہو گئے تھے کیونکہ گردیزی نے اور شعرا کے حالات میں بھی اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ظہور کے ذکر میں لکھا ہے۔

"بخوش بیانی ونیکو بیانی مشہور است۔ در ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خان یقین میکند" (ورق ۵۵)

عمدہ کے ذکر میں لکھا ہے" در ریختہ تتبع انعام اللہ خان یقین می نماید

"شعر را بشستگی ورنگی می گوید" (ورق ۵۶)

خود یقین نے اس بات کا نہایت ایمانداری اور صداقت کے ساتھ اپنے اشعار میں اقرار کیا ہے کہ مرزا مظہر نے ان کی شاعری میں بے حد مدد کی اور اگر مظہر مدد نہ کرتے تو غالباً اُن کے شعر اس درجہ کو نہ پہونچ سکتے وہ کہتے ہیں ؂

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقین
ہو جب استعداد ناقص پیر کامل کیا کرے

ساتھ ہی وہ یہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ میری اس ناقص استعداد کو درست کر کے مرزا مظہر نے خاصہ احسان کیا ہے اور شاید میرے سوا کوئی بھی ان کی قدر نہیں جان سکتا

مجھ سے پتھر کو کیا ہے جیوں نگین حرف آشنا
کون پہچانے یقیں بن حضرت مظہر کی قدر

اس کے علاوہ یقین اپنے اس اعتقاد اور خلوص کا بھی اعلان کر دیتے ہیں جو انہیں مظہر کی ذات کیساتھ حاصل ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مظہر نے کس طرح ایک صاحب ذوق نوجوان کو اپنی شاعرانہ قوتوں اور روحانی صفتوں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں ؂

سایہ بے شخص ٹھہرتا نہیں کہتا ہے یقیں
آپ سے مجھکو جدا حضرت مظہر نہ کرو

اس خلوص و اعتقاد کے بعد ایک درجہ وہ بھی آتا ہے کہ یقین کو اپنے استاد کی ذات پر ناز ہونے لگتا ہے اور وہ اپنی شاعری کی خوبی یا خرابی کی داد صرف انہیں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ کوئی دوسرا ان کے شعر سمجھتا بھی ہے یا نہیں، بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ سوائے مظہر کے اور کوئی ان کی شاعری سے لطف بھی نہیں حاصل کر سکتا۔ کس مزے سے، قسم کھا کر کہتے ہیں

یقین کی گفتگو کے لطف کو واللہ کب کوئی
بغیر از حضرتِ استاد مرزا جان جاں سمجھے

اس کے علاوہ یقین کے کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنی شاعری پر فخر بھی تھا وہ جہاں مظہر سے مستفید ہونے کا ذکر کرتے ہیں اپنی اس کامیابی کا بھی اظہار کر دیتے ہیں جو اس استفادہ سے انہیں نصیب ہوئی تھی اور ایک جگہ کہتے ہیں ؂

یقین تائید حق سے شعر کے میدان کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کوئی آ سکتا ہے؟ کیا قدرت!

ایک اور جگہ اپنے کلام کے اثر کے متعلق نعرہ زن ہیں ؂

سخن کی سحر سے نزدیک ہے یقیں کہ کرے
مری زمین غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص

اس تعلی کے ساتھ ہی ان کا خیال ہے کہ میں ریختہ گوئی کی طرف جس طرح چاہئے، متوجہ نہیں ہوا اگر متوجہ ہوتا تو اور بھی کمال حاصل کرتا کہتے ہیں ؎

نہ آیا سر فرو اید ہر یقین کی فکر عالی کا
زمینوں کو دگر نہ ریختہ کی آسماں کرتا

اس قسم کے دعوٰں کے باوجود یقین کے دل سے کبھی اپنے استاد کے احسان کا خیال دور نہیں ہوتا وہ صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ۔

طبیعت شعر کی اصلاح بن فاسد ہی رہتی ہے
وہی سمجھے یقین یہ بات جو نبض سخن جانے

یقین کی شاعری، جو صرف غزلوں تک محدود رہی، اعلیٰ درجہ کی ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، متاثر ہو کر لکھا ہے۔ پیشہ ور شاعروں کی طرح ان کے یہاں بھرتی کے شعر نام کو نہیں۔ ان کے اشعار زبان حال سے کہتے ہیں کہ ہمارا لکھنے والا در اصل ایک حساس ہستی ایک محبت کا متوالا اور ایک پرجوش عاشق ہے۔

یقین نے عشق و محبت کے جن جذبات پر نہایت جوش اور ولولہ کے ساتھ اشعار لکھے ہیں ان پر ایک مفصل تبصرہ کرنا فرصت کا کام ہے اور شاید اردو غزل گویوں میں ایک اچھی سی جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ سرسری مطالعہ میں جو اشعار اخذ کئے جا سکتے تھے وہ ذیل میں پیش ہیں ؎

میرا جو کام وفا تھا سو ہو سکا نہ یقین — دگر نہ اس کی جفا میں تو کچھ قصور نہ تھا!
گزر جا وصل سے، گر ہجر میں دیکھے رضا اُس کی — محبت میں یقیں! لیتا ہے نام مدعا کوئی؟
ناصحو یہ بھی کچھ نصیحت ہے؟ — کہ یقین یار سے وفا نہ کرے
حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتاں سے پھروں، خدا نہ کرے
سچ کہو اے بلبلو! کس باغ سے آتے ہو تم — ہے ہماری بھی تمہیں کچھ آشیانے کی خبر
جو یار غیر کے ساتھ اس طرف سے ہو گزرے — خدا کے واسطے کوئی مجھے خبر نہ کرے۔
بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
خلوت ہو اور شراب ہو معشوق خوب رو — زاہد! تجھے قسم ہے، جو تو ہو تو کیا کرے؟
یقین مارا گیا جرم محبت پر، زہے طالع! — شہادت اسکو کہتے ہیں، سعادت اسکو کہتے ہیں

شاید اس آخری شعر میں اپنی بیوقت موت کی طرف شاعر نے پیشین گوئی کی ہو!

زبان اور اسلوب بیان کے نقطۂ نظر سے بھی ہمیں یقین ایک اچھے شاعر نظر آتے ہیں اُن کی زبان نہایت صاف اور پاکیزہ ہے، اس قدر صاف اور پاکیزہ کہ اُن کے قریبی زمانہ میں سوائے سوز کے شاید کوئی ان کی اس بے ساختگی اور روانی میں ان پر فوقیت نہیں رکھ سکتا۔ بعض شعر مثالاً پیش ہیں۔

جو کچھ کہیں یہ تجھکو، یقیں! ہے سزا تری ۔۔۔ بندہ جو تو بتوں کا ہوا، کیا خدا نہ تھا؟

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس ۔۔۔ کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا؟

تری جدائی میں کیا جفا اُٹھائی ہیں ۔۔۔ مرے جو پاس تو آتا نہ فاصلہ دور نہ تھا

پلو کو اپنے یقین کی چشم گریاں پر نہ رکھ ۔۔۔ مت کرائے گل آبجو میں امن رنگیں خراب

تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت ۔۔۔ نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سے کیا نسبت

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو ۔۔۔ یقیں! کرتا ہے کوئی اسقدر دیوانہ پن اب کر

تو نہ تھا حیف یقیں! ورنہ دوانہ ہوتا ۔۔۔ آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس

زبان اور مطالب کی خوبیاں یقیں کے یہاں سخت سے سخت بندشوں میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے پاتیں۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ فارسی کے آخری دور کی طرح شمالی ہند کی شاعری کے پہلے دور میں ردیف اور قافیہ کی سخت سے سخت بندشیں شروع ہوگئی تھیں یہ چیز بھی اردو شاعری کے مضر عناصر میں سے ہے یقین کی غزلیں قافیہ اور ردیف کی رنگینیوں سے معمور ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان کی ردیفیں بڑی بڑی بھی ہوتی ہیں۔ بعض زمینوں کے ردیف و قافئے ملاحظہ ہوں۔

۱ رنجور رودینا ۔ کافور کر دینا
۲ کھانے کے کام آتا ۔ بت خانے کے کام آتا
۳ آسمان کے ہاتھ کیا آیا ۔ باغباں کے ہاتھ کیا آیا
۴ گلزار کیوں ہوتا ۔ دلدار کیوں ہوتا ۔
۵ پروانہ سے کیا نسبت ۔ غم کھانے سے کیا نسبت
۶ آزاد کیا کہئے ۔ بیمار کیا کہئے
۷ داد کو پہونچے ۔ فصاد کو پہونچے
۸ صیاد کے آگے ۔ فریاد کے آگے ۔

اس زمانہ کے اور شاعروں کی طرح یقین کے کلام میں بھی وہ الفاظ اور ترکیبیں موجود ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ متذکرہ اشعار میں اس قسم کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ ایک دو یہاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

بتاں خوں کر کے میرا سب لگے آپس میں یوں کہنے ۔۔۔ یہ کافر جیتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا

نہیں معلوم اب کی سال پیمانہ پہ کیا گزرا ۔۔۔ ہمارے توبہ کرنے سیتی میخانہ پہ کیا گزرا

خوباں یقین کو معذور اب تو رکھو کہ اسکے ۔۔۔ لوہو نہیں جگر میں آنسو نسی نہیں میں

یقین کی غزلوں کی آخری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کسی غزل میں پانچ سے زیادہ یا کم شعر نہیں۔ شاید یہ بات عجیب سی ہے۔

یقین کے کلام کے اس مخطوطہ میں کل ۲۹ ورق ہیں۔ تقطیع ½ ۱۰ × ½ ۶ ۔ خط نسخ ۔ عبدالرزاق خاں نے ۱۱۹۵ھ میں نقل کیا ۔ اسپرنگر کی "فہرست کتب خانجات شاہ اودھ" کے صفحہ ۶۴۲ میں یقین کے ایک اور دیوان کا ذکر ہے جو ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا تھا

سید محی الدین قادری

(ام، اے، ام، ار، اے، ایس (لندن))

اب بھی وقت ہے

بیگار

فسانہ

"مہاراج! اس بیلے (وقت) تو مور (میرا) جی جرا (ذرا) کھراب (خراب) ہے ماف (معاف) کر دیئو" یہ کہکر بڈھا جگنا کراہنے لگا۔

مہاراج رام اوتار تھے تو چار روپئے کے پیادہ لیکن مزاج ان کے زمینداروں سے بھی بڑھے ہوئے تھے ان کو جگنا کے حال زار پر کچھ بھی رحم نہ آیا بگڑ کر بولے "میں اسوقت تیری بات نہ مانوں گا اگر تو اپنی خیر چاہتا ہے تو سیدھے سیدھے میرے ساتھ ضلع تک چل وہیں کارندہ صاحب کے سامنے فریاد کر لینا!"

جگنا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے پھر کہا۔ "آج تو مورے حال پر دیا کرو کوئی اور بیگار پکڑ لاؤ"۔ "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا آج تیری باری ہے تجھکو چلنا پڑے گا"

جگنا کی عورت "مسکی" ایک طرف بیٹھی ہوئی وہیں کوٹ رہی تھی اُس نے "موسر" پٹک دی اور بولی "ان کو تو کال (کل) سے بڑے جور کا بکھار (بخار) چڑھا ہے چلنا نہیں سکت ہیں (چل بھی نہیں سکتے) مہاراج اپنی لوہ بند کی لاٹھی سے زمین کو پیٹتے ہوئے گرجے "حرامزادی تو کیوں ٹرٹر کر رہی ہے" جگنا نے بات بگڑتی دیکھکر اپنی عورت کو ڈانٹ بتائی اور مہاراج سے کہا "مہرارو (عورت) کی بات کا تم کچھ خیال نہ کرو رام دے مورے ماں تنکو جو ہوت تو میں جرور چلیوں (اگر مجھ میں ذرا بھی طاقت ہوتی تو میں ضرور چلتا) ٹھیک اسی وقت جگنا کا لڑکا مصریا گھر میں گھس پڑا نہ تھا بالکل اُبھرا ہوا جسم تھا کافی سرخی بدن۔ شباب کا عالم مہاراج کی باتیں سنکر اس کو غصہ آگیا اور بولا "دیکھت تو ہو کہ بابا کا جی کھراب ہے ایسا جلم تو نہ چاہی (دیکھتے تو ہو کہ میرے باپ کا جی نہیں اچھا ایسا ظلم تو نہ کرنا چاہئے) مصریا کی یہ مجال کہ وہ پیادہ سے زبان لڑائے۔ چمار کی یہ ہمت کہ وہ مہاراج کو آنکھیں دکھلائے۔ یہی کی بات یہی سے مہاراج کا مزاج بگڑا ہوا تھا مصریا کی باتوں نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی اُنھوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اپنا جوتا اتار کر مصریا کے سر پر جما دیا اسی گڑبڑی میں مہاراج کی لاٹھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی مصریا نے اپنا سر بچانا چاہا اتفاق سے لاٹھی اچٹ کر مہاراج کے سر میں لگ گئی بس اب کیا تھا۔ مہاراج نے مصریا کو مارتے مارتے زمین پر بٹھا دیا جب تھک گئے تو گالیاں دیتے ہوئے "ضلع" کو واپس ہوئے جاتے وقت یہ دھمکی بھی دیتے گئے "دیوان جی سے کہکر تم لوگوں کو قید نہ کرا دیا تو میرا نام رام اوتار نہیں"

مہاراج چلے گئے تو اب پڑوسیوں نے آکر جگنا کو گھیر لیا "کیا ہوا؟ مہاراج کیوں بگڑ گئے؟" جگنا تو خاموش رہا لیکن مسکی خوب چیخی چلائی۔ سب لوگوں نے زبانی ہمدردی سے کام لیا اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ زمیندار کے پیادہ اور ایک

نیچ اسامی کا معاملہ تھا اگر ساتھ دیتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا جو مصریا کا ہوا تھا۔ ایسے واقعات تو گاؤں میں روز ہی ہوا کرتے ہیں جب پڑوسیوں سے بھی میدان صاف ہوگیا تو میکی نے جگنا سے کہا۔ "اب کا ہوئی (اب کیا ہوگا) مصریا بیچ ہی میں بول پڑا "ہوئی کا۔ زیادہ دکھ دیہیں تو ڈپٹی صاحب سے جاکر فریاد کر بہوں۔ سرکاری عملداری میں ایسا ظلم نہیں ہو سکت۔ جب سے میں لال گنج میں کسان سبھا دیکھ آیو ہوں اب کوؤ سے نہیں ڈرتیوں (ہوگا کیا اگر زیادہ تکلیف دیں گے تو ڈپٹی صاحب سے جاکر فریاد کروں گا سرکاری عملداری میں ایسا ظلم نہیں ہو سکتا۔ جب سے میں نے لال گنج میں کسان سبھا دیکھی ہے اب کسی سے نہیں ڈرتا)" جگنا نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں تیں تو بڑا سورما ہے جب نہیں مبیٹھا جات۔ مہاراج رسیائے کے (خفا ہوکر) لگئے گین ہیں اب جو کچھ نہ ہوئے وہ تھوڑا ہے۔"

۲

برسات ختم ہوگئی تھی شروع جاڑے کا مہینہ تھا تالابوں کا پانی خشک ہو چلا تھا کنول کا پھولنا کم ہوگیا تھا صبح کے وقت زمین شبنم سے بھیگنے لگی تھی شام کو گاؤں کے اوپر دھواں منڈلانے لگا تھا اس وقت صبح کا وقت تھا۔ سردی سے کانپتے ہوئے دیہاتی لڑکے سورج دیوتا سے باہر نکلنے کی التجا کر رہے تھے ایک ساتھ بچے چلا اٹھتے تھے "اللہ میاں گھام (دھوپ) کرو بادل (بدری) اسلام کرو" پنگھٹ پر گاؤں کی البیلی عورتیں جمع ہوگئی تھیں۔ پانی بھرنے کے لئے نہیں بلکہ ہنسی مذاق کرنے کے لئے۔ کوئی کلسہ کو کنوئیں میں ڈالے اپنی بوبلی ساس کی نقل کر رہی تھی تو کوئی اپنی سکھی سے دیدے مٹکا مٹکا کر راز و نیاز کی باتیں کر رہی تھی۔ بوڑھی عورتیں پنے پوتوں کو گود میں لئے دروازے پر کھڑی اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں کہ اتنی دیر ہوگئی اب تک کنوئیں سے نہیں لوٹیں پنگھٹ کے سرے پر ایکھ والے کھیت کے اس طرف خوشنما کھپریلوں کا ایک کچا مگر نفیس مکان تھا گاؤں والے اس کو "حلقہ" (ضلع) کہتے تھے اس ضلع میں "ضلع "بھدین" کے کارندہ لالہ سالک رام رہا کرتے تھے۔ "بھدین" ضلع مرزاپور کا ایک غیر معروف گاؤں ہے اس گاؤں کے زمیندار کنور دلیت سنگھ شہر مرزاپور میں رہتے تھے انہیں اپنے عیش و آرام سے کام تھا کبھی بھولے بسرے بھی "بھدین" میں نہ آتے تھے۔ لالہ سالک رام ان کے باپ کے وقت کے کارندے تھے اسی وجہ سے کنور صاحب کو لالہ جی پر بڑا اعتبار تھا۔ کبھی کنور صاحب کو ایک بیگار کی ضرورت ہوتی تو لالہ جی دس بیگار بھیج دیتے۔ فصل پر آم۔ جامن۔ کٹھل۔ میوہ۔ اناج اور بھوسہ کی گاڑیاں بھی پہنچا دیتے۔ کنور صاحب اسی میں خوش ہو جاتے۔ "بھدیں" میں پٹی داری کا بھی جھگڑا نہ تھا کل گاؤں کے بلا شرکت غیرے لالہ جی ہی مالک تھے تنخواہ تو کل بارہ روپیہ تھی لیکن اوپر کی آمدنی سے مالا مال تھے۔ اضافہ لگان اور بیدخلی سے وہ اسامیوں کا خون چوس لیتے تھے۔ جہاں کسی اسامی نے نذرانہ دینے میں کچھ حیلہ کیا اور انھوں نے لگان بڑھا دیا۔ مہاراج رام اوتار اور سمیا پاسی ان کے دو پیادے تھے۔ یہ ڈال ڈال تھے تو وہ پات پات۔ جس وقت مہاراج رام اوتار مصریا چمار کو پیٹ پاٹ کر ضلع پر واپس ہوئے تو اس وقت لالہ سالک رام "الاؤ" کے سامنے ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔ کبھی کبھی "جمعبندی" کی

ورق گردانی بھی کرتے جاتے تھے ان پاس ہی زمین پر ”دلو“ چودھری اور منشی جمال الدین بیٹھے ہوئے تھے سمیا پاسی ایک طرف بیٹھا ہوا گانجے کا دم لگا رہا تھا۔ مہاراج کو دیکھکر لالہ جی نے پوچھا ”کیوں مہاراج بڑی دیر لگائی کیا کوئی بیگار نہیں ملا ڈپٹی صاحب کے ڈیرہ پر اگر دو گھنٹے کے اندر گھاس نہ پہنچی تو مصیبت آجائیگی“

گاؤں والے اپنی اصطلاح میں کارندہ صاحب کو ”دیوان جی“ کہتے تھے مہاراج نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ”دیوان جی اب تو گاؤں میں رہنا نہ ہوگا“

”کیوں! کیوں! خیریت تو ہے“

جب چمار بھی اکڑنے لگے تو اب کیسے کام چلے گا۔ میں آج صبح اُٹھتے ہی جگنا چمار کو بلانے گیا تو وہ بہانہ کرنے لگا کہ میری طبیعت خراب ہے میں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کا لڑکا مصریا آگیا اور وہ مجھ سے لڑ پڑا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں آپ کا خیال کر کے چپ ہو گیا۔ نہیں تو مارتے مارتے سالے کا دم نکال دیتا“

دلو چودھری بول اُٹھے ”مصریا کو تم ایسا ویسا نہ سمجھو وہ تو کسان سبھا میں بھی جاتا ہے۔ بڑا پاجی ہے“ منشی جمال الدین کیوں خاموش رہتے۔ کارندہ اور پیادوں کی خوشامد ہی سے تو گاؤں میں عزت ہوتی ہے کہنے لگے ”درین چہ شک۔ واللہ ان چماروں کی ذات بھی اس قابل ہے کہ جب تک ان کی اُٹھتے بیٹھتے خبر نہ لی جائے اُن کا مزاج درست نہیں ہوتا“

سمیا پاسی کیوں سب سے پیچھے رہتا۔ ایک مرتبہ اس کی بکری جگنا کے کھیت میں چلی گئی تھی تو مصریا نے سمیا کی خوب خبر لی تھی۔ اس کا بدلہ لینے کا تو یہی موقع تھا۔ چلم کو ایک طرف زمین پر رکھتے ہوئے بولا ” مہاراج بڑی چوک بھئی۔ موکا (مجھے) اپنے ساتھ لیلیو (لے چلتے) تو میں مصریا کی ہیکڑی بھلائے دیتوں (دیتا) دیوان جی حکم ہو تو جاکر ان دونوں چماروں کو پکڑ لاؤں“

دیوان جی نے سر ہلا کر کہا ”ابے ہاں۔ پوچھتا کیا ہے ابھی جا اور ان دونوں کو پکڑ لا“

مہاراج نے کہا ”میں بھی چلتا ہوں“

دونوں پیادے کندھوں پر لاٹھی رکھے ہوئے جگنا کی مڈیا پر پہنچے۔ میکی کہیں سے ہلدی مانگ لائی تھی اس کو پیس کر الاؤ کے سامنے بیٹھی ہوئی مصریا کے بدن پر لگا رہی تھی۔ جگنا ایک طرف پوال پر پڑا ہوا پھٹی پرانی ”کتھری“ اوڑھے کراہ رہا تھا۔

سمیا نے پکارا ”ابے او جگنا۔ ابے او مصریا چل تو کا دیوان جی بلاوت ہیں (چلو دیوان جی بلاتے ہیں)“

اس مرتبہ جگنا کی آہ و زاری نے کچھ کام نہ دیا۔ مصریا اور جگنا کو دونوں پیادے کشاں کشاں ”ضلع“ کی طرف لے چلے پیچھے پیچھے میکی بھی ”سنکٹا دیوی“ کی منتیں مانتی ہوئی روانہ ہوئی۔ گاؤں کے تماشائی بھی ساتھ ہوئے۔ جب یہ سارا قافلہ ضلع پر پہونچا تو تماشائی باہر ہی رہ گئے احاطہ کے اندر جانے کی ان میں ہمت نہ تھی ”کہ گہ جھوڑ جلا ہے جائے۔ ناحق چوٹ بیچارہ کھائے“ والی مثل سے وہ لوگ خوب واقف تھے۔

۳

آج کل حاکم پرگنہ دورہ پر تھے "بھدین" کے قریب ہی ایک باغ میں ان کا خیمہ لگا تھا چونکہ ڈپٹی صاحب ابھی حال ہی میں تبدیل ہو کر آئے تھے۔ ہر شخص ان کو خوش کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ پرانے ڈپٹی صاحب سے تو لالہ سالک رام کی جان پہچان تھی لیکن نئے ڈپٹی صاحب سے ناواقف تھے پھر بھی انکو خوشی تھی کہ پیشکار صاحب ان کے پرانے دوست ہیں چنانچہ پیشکار صاحب نے جب کہلا بھیجا کہ بیگار کی ضرورت ہے تو فوراً اس کا انتظام فوراً کر دیا لیکن احتیاطاً ایک اور بیگار لانے کے لئے مہاراج رام اوتار کو حکم دیا لیکن آج سویرے سویرے ہی زندگی بھر میں پہلی مرتبہ دیوان جی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا غصہ میں بھرے بیٹھے ہی تھے کہ جگنا اور مصریا اُن کے سامنے پیش کئے گئے تمام غصہ انہیں سرکشوں پر نکالا اور چلا کر بولے "کیوں بے حرامزادو اب تم لوگوں کی یہ ہمت ہو گئی ہے کہ مہاراج سے جھگڑا کرنے لگے ہو دیکھو اب میں تمہاری کیا گت بناتا ہوں"

جگنا نے ہاتھ جوڑ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ہجور (حضور) میں تو مہاراج سے اتنے کہوں رہا کہ مو کا بکھار ہے بس یہی پر یہ رسیائگیں اور مصریا کو مارن لاگین (میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مجھے بخار ہے بس اتنی سی بات پر مہاراج خفا ہو گئے اور مصریا کو مارنے لگے)

مہاراج نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "ابے جھوٹ کیوں بولتا ہے"

دیوان جی کو اپنا بدن دکھاتے ہوئے مصریا نے دبی زبان سے کہا "سرکار خود دیکھ لیں"

بڑے آدمیوں میں یہ ایک خاص صفت ہوتی ہے کہ جس بات کا وہ پہلے فیصلہ کر لیتے ہیں اس کے خلاف پھر کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ رام اوتار برہمن تھے مصریا اور جگنا چمار تھے ان کا مقابلہ ہی کیا تھا۔ ایک "شریف" برہمن کے سامنے نیچوں کی کون سنتا ہے۔ دیوان جی کے سامنے نیکی اور بدی میں جنگ ہو رہی تھی۔ ایک طرف فرض دوسری طرف غرض۔ ایک طرف محبت دوسری طرف انصاف۔ ایک طرف دنیا دوسری طرف دین کا خیال تھا۔ لیکن دیوان جی کا تو دل چھل۔ کپٹ۔ فریب ریاکاری سے سیاہ ہو چکا تھا۔ خود غرضی دولت اور ثروت نے ان کی آنکھوں پر پٹی اور کانوں میں روئی دیدی تھی ایسی حالت میں انسان سنتا ہے مگر نہیں سنتا دیکھتا ہے مگر نہیں دیکھتا۔ دیوان جی نے سوچا کہ اگر وہ چماروں کا ساتھ دیں گے تو جگ ہنسائی ہوگی مہاراج کا تمام علاقہ میں اثر ہے۔ وہ بڑی بدنامی کرائیں گے بالائی آمدنی کا ذریعہ جاتا رہے گا یہی سب کچھ سوچ کر انھوں نے قصداً انصاف کا خون کیا۔ انھوں نے اشاروں ہی اشاروں میں سمیا پاسی کو اپنا فیصلہ دیدیا ـــــ اور بڈھے جگنا اور مصریا پر مار پڑنے لگی ان کی آہ و بکا سے "ضلع گونج اُٹھا" نرم دل اس جگہ سے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ دوسروں کے بل پر اکڑنے والے سنگدل مونچھوں پر تاؤ دینے لگے "میکی" "سرکار کی دُہائی" دینے لگی ٹھیک اسی وقت باہر کچھ شور ہوا۔ "ڈپٹی صاحب آگئے" سمیا نے ہاتھ روک لیا۔ لالہ جی اپنی دہوتی سنبھالتے ہوئے کھڑے ہو گئے مہاراج کے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔

جگنا ایک طرف زمین پر بیہوش پڑا تھا اس کے زیادہ چوٹ لگی تھی۔ مصریا طاقتور تھا اتنی مار کھانے پر بھی وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دیوان جی نے بڑے ادب سے جھک کر پہلے ڈپٹی صاحب کو اور پھر پیشکار صاحب کو سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب کو تو خوف یا ڈر سے

لیکن پیشکار صاحب کو اپنا مددگار سمجھکر۔ آخر انہیں کے لئے تو یہ مفت کی بیگار ی تھی کیا اب وہ دیوان جی کی مدد نہ کریں گے؟

ڈپٹی جانتی پرشاد بڑے نیک دل اور منصف مزاج تھے آج کل اس صفت کے حاکم مشکل سے ملتے ہیں لیکن اس زمانہ میں کوئی ہر ایک کو خوش نہیں رکھ سکتا چنانچہ جہاں ڈپٹی صاحب سے سارا اعلاقہ خوش تھا وہاں ایسے بھی لوگ تھے جو ان سے ناراض تھے ان کی منصف مزاجی سے پیشکار۔ اردلی۔ غرضکہ ان کا سارا عملہ نالاں رہتا تھا۔ پرانے ڈپٹی صاحب کے زمانہ میں اہلکاروں کی چاندی تھی لیکن اب سوکھی تنخواہ میں ان کا مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ ڈپٹی جانتی پرشاد کے سامنے امیر غریب سب برابر تھے شریف پرور ہوتے ہوئے غریب پرور بھی تھے۔ جگنا اور مصریا کے حال زار پر ان کو رحم آگیا ان کی تجربہ کار نظروں نے سب کچھ معلوم کرلیا۔ ظالم اور مظلوم کی حالت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ حاکم پرگنہ کے قیام کے زمانہ میں بھی یہ اندھیر کھاتہ! ایسا ظلم! ان کے خواب وخیال میں بھی نہ آیا ہوگا۔ ڈپٹی صاحب نے دیوان جی سے مخاطب ہوکر پوچھا "کیا آپ ہی اس گاؤں کے کارندہ ہیں؟"

دیوان جی نے خوشامدانہ لہجہ میں جواب دیا "جی حضور"

ڈپٹی صاحب نے چماروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان غریبوں کی ایسی کونسی خطا تھی جسکی پاداش میں آپ کو قانون اپنے ہاتھ میں لینا پڑا"

اب تو دیوان جی کی گھگھی بندھ گئی گھبرا کر پیشکار صاحب کی طرف دیکھنے لگے ایک مرتبہ پہلے بھی جب دیوان جی نے کسی اسامی کو پٹوایا تھا تو اس نے سابق ڈپٹی صاحب سے جاکر فریاد کی لیکن پیشکار صاحب کی عنایت سے دیوان جی کو تو کچھ نہ ہوا بلکہ الٹا اسامی ہی کو تین ماہ کے لئے جیل جانا پڑا تھا۔ لیکن آج خلاف معمول پیشکار صاحب کی آنکھوں سے بجائے ہمدردی کے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا دیوان جی کو "بسوہ کے بجائے بیگھہ" کاشت کو غیر کاشت "موروثی کو غیر موروثی" بنادینے کا خوب تجربہ تھا لیکن انھیں اس کا بالکل تجربہ نہیں تھا کہ اہلکار حاکم پرگنہ کے اشاروں پر ناچتے ہیں جس رنگ میں اپنے حاکم کو دیکھتے ہیں اسی میں وہ خود بھی رنگ جاتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کی نگاہیں پھری دیکھکر بھلا پیشکار صاحب کچھ سفارش کرنے کی کیسے جرأت کر سکتے تھے۔

دیوان جی کو بحر خیال میں غوطے لگاتے دیکھکر ڈپٹی صاحب نے مکرر دریافت کیا تو دیوان جی نے کہا "حضور! ان چماروں نے میرے پیادے کی جو برہمن ہے بڑی بے عزتی کی ہے"

ڈپٹی صاحب نے مسکرا کر کہا "ان غریب چماروں نے؟"

ڈپٹی صاحب کو مسکراتے دیکھکر دیوان جی بھول گئے۔ بقول تلسی داس جی جس طرح سوکھے تال اور تلیاں برساتی۔ پانی پاکر آپے سے باہر ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح کمظرف آدمی بھی ذرا سی بات پر اترانے لگتا ہے۔ دیوان جی نے اپنے خاص منشیانہ لہجہ میں جواب دیا۔ "حضور آپ ان چماروں کو غریب نہ سمجھیں یہ بڑے موٹے اسامی ہیں ان کی سرکشی تو گاؤں بھر میں مشہور ہے۔ یہ آپ ہی لوگوں کا اقبال ہے کہ میں ان کو دبلائے رکھتا ہوں ورنہ یہ لوگ تو ہمارا گاؤں رہنا دشوار کردیں۔ حضور ابھی ان لوگوں سے واقف نہیں ہیں"

ڈپٹی صاحب کا لہجہ بدل گیا انھوں نے کہا "یہ سب کچھ سہی مگر آپ کو یہ کسی نے اختیار نہیں دیا کہ آپ ان لوگوں کو کوئی سزا دیں

اگران کے خلاف آپ کو کوئی شکایت تھی تو آپ قانونی کارروائی کر سکتے تھے آخر ہم لوگ کس واسطے ہیں" یہ کہکر ڈپٹی صاحب نے مصریا سے اس کا حال پوچھا وہ خوف بھری نظروں سے دیوان جی کی طرف دیکھنے لگا جس کا مطلب تھا" بتانے کو تو سب بتا دوں لیکن آپ کے جانے کے بعد میری جو گت بنے گی اس کا ذمہ دار کون ہوگا" ڈپٹی صاحب اس کا مطلب سمجھ گئے انھوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم کچھ خوف نہ کرو اب دیوان جی تمہارا کچھ نہیں کر سکتے" لیکن مصریا اب بھی خاموش تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکتا تھا۔ آخر کار اس مشکل کو اس کی ماں میکی نے ڈپٹی صاحب کے سامنے آکر حل کر دیا۔ عورت کا دل نازک ہوتا ہے۔ جوان بیٹے اور بڈھے شوہر کی مصیبت کو دیکھکر وہ کیسے خاموش رہ سکتی تھی۔ جب کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا تب تو وہ چپ نہ رہ سکی تھی اب ڈپٹی صاحب ایسے ہمدرد کو پاکر وہ اس موقع کو بھلا کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔ وہ روتی ہوئی ڈپٹی صاحب کے پاؤں پر گر پڑی ——— "دہائی ہے سرکار کی۔!"

ڈپٹی صاحب جلدی سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے اس خیال سے نہیں کہ میکی چمارن ہے بلکہ اس وجہ سے کہ خوشامد انصاف کا خون کر دیتی ہے۔

میکی نے رو رو کر ساری سرگزشت شروع سے لیکر اخیر تک سنا دی۔ اب انصاف کی باری آئی دیوان جی، مہاراج، رام اوتار، ہمیا پاسی کے بیانات قلمبند کئے گئے۔ منشی جمال الدین اور چودھری دو موقع کے گواہ بنائے گئے

ڈپٹی صاحب نے میکی سے کہا "تمہارے لڑکے اور شوہر کو ڈاکٹری معائنہ کے لئے مرزاپور جانا پڑے گا" میکی جوش انتقام میں پاگل ہو رہی تھی اس نے کہا "جو حکم ——"

۴

سول سرجن نے مصریا کو "ضرب خفیف" اور جگنا کو "ضرب شدید" کا سرٹیفکٹ دیا۔ اب پولیس کی کارروائی شروع ہوئی۔ داروغہ جی مع اپنے چند "نفر" کانسٹبلان کے "بھدین" میں رونق افروز ہوئے۔ جتنے پر سب کچھ موجود تھا۔ گھوڑے کے سامنے گھاس ڈال دی گئی۔ دودھ کے گھڑے آگئے۔ خوان نعمت بچھ گیا تر لقمے اڑنے لگے جنھیں اپنے گھر میں سوکھی روٹی بھی مشکل سے ملتی تھی وہ پوری کچوری حلوہ وغیرہ کو دیکھکر ناک بھوں چڑھانے لگے۔ دماغ زمین سے آسمان پر پہنچا۔ ان سب تکلفات "یا" "حقوق" سے فراغت پاکر داروغہ جی نے تفتیش شروع کی۔ اڑوس پڑوس میں پکڑ دھکڑ ہونے لگی کسی کو ڈرایا کسی کو دھمکایا۔ حاکم پرگنہ کے حکم سے اس مقدمہ کی بنیاد پڑی تھی ان کا خیمہ ڈیرہ بھی بھدین کے قریب لگا ہوا تھا اس وجہ سے داروغہ جی کو زیادہ پاؤں پھیلانے کا موقع نہ ملا پھر بھی انھوں نے اپنا کچھ بھلا کر ہی لیا شہادت کافی سے زیادہ بہم پہنچ گئی اور داروغہ جی نے اپنی تفتیش مکمل کر کے ڈپٹی جانکی پرشاد کے یہاں مہاراج رام اوتار۔ دیوان جی سالک رام اور ہمیا پاسی کا اس جرم میں چالان کر دیا کہ ان لوگوں نے جگنا اور مصریا کو حبس بیجا میں رکھکر اذیت جسمانی پہنچائی۔ اس کی خبر بھدین کا تو ذکر کیا دور دور تک پہنچ گئی۔ کنور صاحب کو تو اپنے عیش و عشرت سے کام تھا۔ معاملہ مقدمہ سے ان کی روح فنا ہوتی تھی پھر بھی ضمانت دیکر ملزموں کو رہائی دلائی ایسا نہ کرتے تو ان کی بدنامی ہوتی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے ڈپٹی صاحب کے

پاس جاکر سفارش کرنے کی انہیں جرأت نہ ہوئی مرزاپور دالیں جاکر مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے انھوں نے ایک وکیل بھیجدیا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ دیوان جی اور مہاراج نے وکیل صاحب کے سامنے رو رو کر کہا "وکیل صاحب! جس طرح بھی ہو ہماری عزت بچالو۔ روپیہ پیسہ کی کچھ فکر نہ کرنا ہم آپ کو خوش کر دیں گے"

وکیل صاحب مقدمہ کے حالات سے واقف ہو چکے تھے انھوں نے جواب دیا۔"مقدمہ بہت سنگین ہے کامیابی کی بہت کم امید ہے"

یہ سنتے ہی مہاراج اور دیوان جی کے چہروں پر اداسی چھاگئی۔ دیوان جی نے اداس ہوکر کہا "تو کیا اب ہماری عزت کسی کسی طرح نہیں بچ سکتی؟"

وکیل صاحب نے کہا "بس ایک ترکیب رہ گئی ہے"

سوکھے دہانوں میں پانی پڑگیا سب نے ایک زبان ہوکر کہا "وہ کیا"

وکیل صاحب نے جواب دیا "قانون سے تو تم لوگ کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ ہاں اگر بھگنا ڈپٹی صاحب سے جاکر کہدے کہ اسکو تم لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہے تو بہت ممکن ہے کہ ڈپٹی صاحب مقدمہ خارج کر دیں" ترکیب تو اچھی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ بھگنا سے کون جاکر کہے اور کہے بھی تو کس منہ سے۔ مصریا اور بھگنا کی بے عزتی کر کے کوئی ان سے سفارش کی کیسے درخواست کر سکتا تھا ایک بات اور تھی مہاراج اور دیوان جی چماروں کے سامنے جاکر کیا اپنا سر اٹھا سکتے تھے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وکیل صاحب کی رائے پر کوئی عمل کرنے کرنے لئے تیار نہ ہوا۔ دیوان جی کا اپنا "بھدین" میں کوئی نہ تھا جو ان کے غم میں شریک ہوتا۔ ایک دور کے رشتہ دار کو اپنے وطن غازی پور سے بلایا تھا لیکن انھوں نے بھی کورا جواب بھیج دیا تھا کہ "مجھے فرصت نہیں ہے" مہاراج کا گھر "بھدین" ہی میں تھا "مہاراجن" کے سوا ان کا بھی اس دنیا میں کوئی اپنا ساتھی نہ تھا۔ سمیا پاسی کا کنبہ بڑا تھا لیکن اس کی بساط ہی کیا وہ تو دیوان جی اور مہاراج کے ہاتھوں میں کھلونا تھا۔ جب وکیل صاحب کے پاس سے مہاراج اپنے گھر پہنچے تو مہاراجن نے پوچھا۔

"سب کشل (خیریت) تو ہے"

مہاراج نے اداس ہوکر جو کچھ انھوں نے وکیل صاحب سے سنا تھا مہاراجن سے کہدیا۔

"مقدمہ کب ہوگا؟"

"کل سویرے۔ ۱۰ بجے"

مہاراجن کا کلیجہ دھڑکنے لگا اس نے کہا۔ "میں بھگنی سے جاکر کہونگی وہ میری بات ضرور مان لیگی" "نہیں نہیں تم ان چماروں کے یہاں ہرگز نہ جانا میں یہ بے عزتی نہیں برداشت کر سکتا کہ تم چماروں کی خوشامد کرو اس سے تو مرجانا ہی اچھا ہے" مہاراجن چپ ہوگئیں مہاراج تھوڑی دیر کے بعد پھر گھر سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد مہاراجن نے بھی گھر سے قدم باہر نکالا۔ دن ڈوب رہا تھا مویشی چراگاہ سے واپس ہو رہے تھے چھوٹے چھوٹے بچے جو دنیا کی فکروں سے آزاد ہیں کوئی مٹی کے گھروندے بنا کر کھیل رہا تھا اور کوئی

"گلی ڈنڈا" سے اپنا دل بہلا رہا تھا - مہاراجن نے جلدی جلدی اپنا قدم بڑھایا وہ میکی سے ملنے جا رہی تھیں پہلے تو انھوں نے بھی یہی سوچا تھا کہ چماروں کی خوشامد کرنے سے تو مر جانا ہی اچھا ہے لیکن جب انھوں نے مہاراج کی آنے والی مصیبت کا خیال کیا تو انکا کلیجہ کانپ اُٹھا شوہر کی محبت میں وہ اس بے عزتی کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئی اور وہ بہت جلد میکی کے پاس پہنچ گئیں - جگنا اور مصریا تو کہیں باہر گئے ہوئے تھے میکی ہی اکیلی اپنے منڈیا میں بیٹھی ہوئی "لکنی" کا بھات پکا رہی تھی - مہاراجن کو دیکھکر اس کا دماغ عرش پر پہنچ گیا میکی کے دل میں خوشی کے جذبات اُٹھنے لگنے - وہ سوچنے لگی "اوہو مہاراجن میری خوشامد کرنے آئی ہیں اب ان کا وہ غرور کدھر گیا کاش اس وقت مصریا اور اس کا باپ گھر پر ہوتا کاش تمام گاؤں والے آکر دیکھتے کہ مہاراجن ایک نیچ چمارن کے یہاں آئی ہیں" یہ پہلا انتقام تھا میکی نے اپنی طبیعت کو سنبھال کر کہا - "دھن ہے مہاراجن! گریبن (غریبوں) کی منڈیا میں تم کیسے آگئیں؟"

جملہ طعنہ آمیز تھا کوئی اور وقت ہوتا تو مہاراجن میکی کی خوب خبر لیتی لیکن آج بگڑنے کا موقع نہیں تھا - مہاراجن نے کہا "میکی ——"

میکی مہاراجن کی طرف غور سے دیکھنے لگی تھوڑی دیر تک مہاراجن چپ رہیں وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں - ایک طرف مہاراجن کی خودداری اور خاندانی وقار ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ ایک چمارن سے کوئی درخواست کریں لیکن دوسری طرف مہاراج کی عزت کا سوال تھا اگر ان کو سزا ہو گئی وہ قید ہو گئے تو کیا اس میں مہاراجن بے عزتی نہ ہوگی آخر کار مہاراجن نے رک رک کر کہا "میکی! میں آج تم سے بھیک مانگنے آئی ہوں" اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکیں - منھ ڈھانپ کر رونے لگیں -

میکی کانپ اُٹھی - مہاراجن اور ایک نیچ چمارن سے بھیک مانگیں، میکی کے کانوں میں یہی صدا گونجنے لگی "میں تم سے بھیک مانگنے آئی ہوں" میکی گنوار اور جاہل ہوتے ہوئے بھی اتنی بیوقوف نہ تھی کہ وہ مہاراجن کا مطلب نہ سمجھتی - اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے سر پر انتقام کا بھوت سوار تھا لیکن مہاراجن کی حالت پر اسکو رحم آگیا - وہ عورت تھی عورت کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھی - مہاراجن کے درد آمیز جملہ نے اس کا دل پگھلا دیا اس کے سر پر سے انتقام کا بھوت اتر گیا - میکی کا تو یہی مقصد تھا کہ دشمنوں کا سر نیچا ہو دشمن خود اپنی زبان سے شکست کا اقرار کرے یہی سچی فتح ہے میکی نے کہا "مہاراجن گسیاں (پرماتما) تمہیں بنائے رکھیں ہم تمہرے حکم سے باہر نہ ہوئیے (ہوں گے)۔"

مہاراجن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں انھوں نے جوش محبت میں میکی کا ہاتھ تھام لیا اور کہا "ڈپٹی صاحب سے کہلا دو کہ وہ مقدمہ اُٹھالیں" یہ کہکر مہاراجن نے ایک پوٹلی جن کو وہ اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوئی تھیں نکال کر میکی کے پاؤں پر رکھدی اس کے اندر کچھ روپیہ اور مہاراجن کے چاندی کے زیور تھے لیکن سخت اصرار کرنے پر بھی میکی نے لینے سے انکار کر دیا - آج مہاراجن کو بھی اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ شرافت کسی کا ورثہ نہیں یہ لعل بے بہا کبھی اونچے گھرانوں کے محلوں میں چمکتا ہے تو کبھی گھاس پھوس سے چھائی ہوئی جھونپڑیوں کو بھی روشن کرتا ہے -

میکی کے اطمینان دلانے پر مہاراجن خوش خوش اپنے گھر واپس ہوئیں۔

۵

آج ڈپٹی جانکی پرشاد کی عدالت میں خاص رونق تھی وہ لوگ جو عدالت سے دور بھاگتے تھے انھوں نے بھی آج پرانے کپڑوں کو دھو دھلا کر زیب تن کیا۔ خوب سنبھال کر پگڑی باندھی اور عدالت میں پہنچ گئے جن کو اندر جگہ نہ ملی وہ باہر ہی کھڑے ہو کر مقدمہ کی کاروائی دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ تماشائی ٹوٹے پڑتے تھے۔ وقت مقررہ پر ڈپٹی صاحب تشریف لائے چاروں طرف خاموشی چھا گئی لوگ سانس لیتے تھے مگر رک رک کر کہ کہیں آواز نہ نکل جائے اور چپراسی عدالت سے باہر نکال دے۔ دیوان جی سالک رام۔ مہاراج ورام اوتار اور سمیا پاسی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے ملزموں کے اداس چہروں پر سب کی نگاہیں پڑ رہی تھیں مقدمہ کی کاروائی شروع ہی ہونے والی تھی کہ جگنا نے ہاتھ جوڑ کر ڈپٹی صاحب سے کہا "حجور ہمکا کچھ شکایت نہیں ہے مقدمہ اٹھالیں" سب لوگوں نے حیرت سے جگنا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوف یا ڈر کے بجائے استقلال کا پتہ چلتا تھا۔ دروغہ جی غضب آلود نظروں سے جگنا کو گھورنے لگے ڈپٹی صاحب کو بھی اس کا یا پلٹ پر سخت تعجب معلوم ہوا ملزموں نے احسانمند نگاہوں سے جگنا کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں معذرت کا پیغام پوشیدہ تھا۔

ڈپٹی صاحب نے سوچا شاید جگنا کو رشوت دی گئی ہے یا اس پر کسی نے زور ڈالا ہے انھوں نے کہا "جگنا خوب سوچ سمجھ لے۔ تجھے کسی نے ڈرایا دھمکایا تو نہیں ہے اگر ایسی کوئی بات ہو تو صاف صاف بتا دے تجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

جگنا نے جواب دیا "حجور ہمیں کسی نے ڈرایا دھمکایا نہیں ہے ہم خوشی سے چاہت (چاہتے ہیں) کہ آپ مقدمہ اٹھالیں"

اب کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ ڈپٹی صاحب انصاف پسند ہوتے ہوئے شریف پرور بھی تھے وہ صلح صفائی کی کاروائی میں کوئی اعتراض نہیں کرتے تھے انھوں نے سوچا کہ ملزموں کی کافی بے عزتی ہو چکی ہے جگنا اور مصریا کو گاؤں میں رہنا ہے "دریا میں رہ کر مگر سے بیر" بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے انھوں نے ملزموں سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھو اب کبھی بیگار نہ لینا اسامیوں پر سختی نہ کرنا میل جول سے جو کام نکل جاتا ہے وہ ظلم سے کبھی نہیں نکل سکتا ہے۔ اپنی حماقت کا تم لوگوں کو کافی سبق مل چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ آئندہ احتیاط سے کام لوگے"

یہ کہکر ڈپٹی صاحب نے مقدمہ خارج کر دیا۔ عدالت سے باہر نکل کر گاؤں والے دیوان جی اور مہاراج کو مبارکباد دینے لگے لیکن ان لوگوں نے بھیڑ سے نکل کر جگنا کو آواز دی "جگن بابا"

جگنا کو آج تک کسی نے "جگن بابا" کہکر نہیں پکارا تھا وہ فرط خوشی سے بیتاب ہو گیا اور دوڑ کر دیوان جی کا پاؤں چھو لیا مصریا نے مہاراج کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ اسوقت دیوان جی یا مہاراج کو اس بات کا خیال بالکل نہیں تھا کہ چماروں نے ان کے پاؤں کیوں چھوا اس وقت انکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے یہ آنسو خوشی کے تھے رنج یا حقارت کا ان میں کوئی نشان نہ تھا۔ اس وقت نیچ "اونچ" کا کا سوال نہ تھا یہ پریم ملاپ تھا۔ سمیا پاسی کے ساتھ ہی سب لوگ یکبارگی چلا اٹھے "جگن بابا کی جے"

اعظم کریوی

ڈرامے کا ایک سین

نمبر ۱

شاہنواز بانی سلطنت جمہوری کا جہاز بندرگاہ دمشق پر کنارے کے قریب پہونچتا ہے کہ اتفاقاً اُس میں آگ لگ جاتی ہے ۔ اس خوفناک منظر کو یعقوب ملک التجار کنارہ سے دیکھتا ہے اور اپنی کشتی مصیبت زدہ مسافروں کی امداد کو روانہ کرتا ہے اتفاق سے صرف ایک ہی شخص یعنی شاہنواز یعقوب کے مددگاروں کے ذریعہ سے زندہ کنارہ پر پہونچتا ہے اور باقی سب طعمۂ اجل ہوجاتے ہیں ۔

نمبر ۲

زبیدہ یعقوب کی حسین لڑکی حالت بیماری میں شاہنواز کی تیماردار ہوتی ہے، ایک طویل زمانہ کی یکجائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پری جمال زبیدہ نوجوان شاہنواز کو دل دے بیٹھتی ہے لیکن خلاف اُمید شاہنواز اس کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے ۔ کیونکہ یہ تلوار کا عاشق عورت کی محبت کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ شاہنواز اپنے محسن سوداگر یعقوب سے رخصت طلب کرتا ہے اور اپنی نوآبادی کا ارادہ کرتا ہے رخصت مل جانے پر ایک آخری اُمید زبیدہ کو پیدا ہوتی ہے اور ایک رقعہ کے ذریعہ سے شاہنواز کو اپنے باغ میں بلواتی ہے ۔

نمبر ۳

حسب قرارداد زبیدہ آدھی رات گزرجانے کے بعد مقام مقررہ پر شاہنواز کا انتظار کر رہی ہے ۔

زبیدہ (آپ ہی آپ) مہیب رات ۔ خوفناک وقت ۔ وحشت انگیز رات نے اپنی زلف دراز کا سایہ مخلوقات عالم پر پھیلا دیا ذیحیات ہستیاں محوِ خواب ہیں

شب تار یک نے ڈالے ہیں یہ کیا دراز آسمانوں میں　　چھپے ہیں خوفِ ظلمت سے پرندے آشیانوں میں

ہوا کی سنسناہٹ تیر بن جاتی ہے کانوں میں　　جگاتے ہیں مجھ کو جادوگر مسانوں میں

ہوا پر اُڑکے ٹکڑے ابر کے طوفان لائے ہیں

کہاں پر کھینچ کر مجھ کو مرے ارمان لائے ہیں

وہ ابھی تک نہیں آیا ۔ آئیگا ضرور آئیگا اور دنیا کے اسٹیج سے یہ سیاہ پردہ اُٹھنے سے پہلے میری قسمت کا فیصلہ ہوجائیگا ۔

شاہنواز ایک سیاہ جبہ میں داخل ہوتا ہے

زبیدہ ۔ دہوئیں کی طرح شب تاریک میں صنف نازک کی طرف بڑھنے والے سایہ (خفیہ لفظ)

شاہنواز ۔ پریسیڈنٹ سلطنت جمہوری

زبیدہ ۔ اوہ مجھے انتظار کی تکلیف دیر تک اٹھانا نہیں پڑی، اس لئے میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں ۔ پیارے شاہنواز!

شاہنواز۔ (بات کاٹ کر) ٹھہرو۔ تم نے کیا کہا، پیارے شاہنواز،
بیگم اس بیباکی کے کیا معنے جو لفظ عشق کی دنیا میں استعمال کیا
جاتا ہے وہ ایک سپاہی کو مخاطب کرنے کے لئے موزوں نہیں اور
پھر میری معمولی خدمت کسی غیر معمولی شکریہ کی سزاوار نہیں۔

بیگم۔ (خود بخود) کیا دلشکن لہجہ کیسا تلخ جواب! اچھا بہادر نبرد آزما
صاحب، مجھے اس قدر تو مایوس نہ کیجئے کہ اظہار مدعا کے الفاظ
تلخ ہوکر میرے ہونٹوں سے نفرت کرنے لگیں۔

شاہنواز۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس مشتبہ ملاقات کو
جلد سے جلد ختم کر دیں گے۔

بیگم۔ کیا بیوفایانہ برتاؤ اور کیسا بیمروتانہ طرز عمل ہے۔ سنو مجھے تم سے
کچھ کہنا ہے میں کہونگی اور تمہیں سننا پڑے گا

شاہنواز۔ اچھا یہ بھی سہی اگرچہ میں نے عورتوں کے حکم کی تعمیل آج
سے پہلے کبھی نہیں کی۔

بیگم۔ شاید تمھارے دل میں اس ودیعت کی قدر نہیں جس کو تعلیم یافتہ
انسان محبت کہتے ہیں۔

شاہنواز۔ (تبسم آمیز لہجہ میں) میں سپاہی ہوں اور سپاہی کو محبت
کی دلفریبی کا حس نہیں ہوتا۔ ہاں تو آپ اس غرض خاص کو بیان
کرنے میں ذرا جلدی کریں جسکے سننے کیلئے میں بلایا گیا ہوں۔

زبیدہ (خود سے) نا امیدی، مایوسی، عجیب شخص! غالباً تم اب تک بھی
نہیں جانتے کہ عشق کیا چیز ہے

شاہنواز۔ بس اتنا ہے کہ انسانوں کے ہر طبقہ میں ایک مجنونانہ
حرکت کا نام عشق ہے

زبیدہ۔ پیارے شاہنواز۔ اے توبہ معاف کرنا خدا بُرا کرے
جذبۂ بے اختیار شوق کا جس نے مجھے دوبارہ گناہگار بنا دیا شاید
ابھی آپ نے حکم دیا تھا کہ میں پیارے کا لفظ آپ کے لئے استعمال
نہ کروں۔

شاہنواز۔ بالکل صحیح ہے کیونکہ ایک سپاہی کو مخاطب کرنے کے لئے
اس نسوانیت اثر لفظ میں کوئی شان پیدا نہیں ہوتی۔

زبیدہ۔ تم جاہل ہو

شاہنواز۔ اس کا مجھے فخر سے اعتراف ہے کیونکہ بہادر اور
جاہل قریب قریب ہم معنی الفاظ ہیں۔

زبیدہ۔ تم نے عشق کی تعریف کرنے میں غلطی کی

شاہنواز۔ یہ بھی ممکن ہے۔ اب آپ عشق کی صحیح تعریف بیان کردیں

زبیدہ۔ سنو عشق اک الہامی طاقت ہے وہ اپنے سحر آفریں کرشموں
سے عقل کی طاقت پر غالب آتا ہے اور ہر جگہ نئی صورت اختیار کرتا ہے

کہیں وہ نور بنتا ہے کہیں وہ نار بنتا ہے — کہیں وہ پھول بنتا ہے کہیں وہ خار بنتا ہے
کبھی وہ دلشکن بنتا ہے گہہ دلدار بنتا ہے — کہیں وہ داروئے صحت اور کہیں آزار بنتا ہے

کہیں پورا مسیحا ہے کہیں بیدرد قاتل ہے
کہیں جگی ہوئی قسمت کہیں ٹوٹا ہوا دل ہے

شاہنواز۔ اخاہ یہ تین حرف کا لفظ اور جذبات انسانی کا مجموعہ
خیر بیگم اگر یہ عشق کی سچی تعریف ہے تو ہوگی

بس اس کی طالبان عشق کو آرام آئیگا — مجھے کیا عشق سے مطلب مرے کس کام آئیگا

زبیدہ۔ کیا تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی

شاہنواز۔ کی ہے اور اب بھی کرتا ہوں

زبیدہ۔ کس سے

شاہنواز۔ تبر سے تلوار سے خنجر سے اور پیکاں سے — خوں بھری شمشیر سے لاشوں بھرے میدان سے
فوج کی موجوں سے بحر موت کے طوفان سے — خون کے سیلاب سے اور زخم کے ارمان سے

ہوتا ہی ہر ہر قدم پر انقلاب زندگی زیست کا وقفہ سپاہی کو ہی خواب زندگی

زبیدہ ۔ نبرد آزما نوجوان انہیں شجاعت کے قصوں نے انہیں جوانمردی کے داستانوں نے ایک عورت پر بھی وار کیا ہے ۔

یہی قصے ہیں اے آمادہ دل آزاری پہ جو سنائے ہیں مجھے بستر بیماری پر
دوست دشمن کو بہرکیف دغا سے مارا تیرے اسکو مجھے تیر ادا سے مارا

شاہنواز ۔ بیگم اب ہماری آپ کی ملاقات ختم ہونا چاہیے

زبیدہ ۔ نہیں شاہنواز نہیں بشر کہدو کہ زبیدہ میں تجھے چاہتا ہوں

شاہنواز ۔ تم غلط فہمی میں مبتلا ہو جذبات جوانی تمہیں دھوکا دے رہے ہیں اور تم اپنی عالم فریب حسن کو ایک سپاہی کی تلوار پر قربانی چڑھا رہی ہو ۔ سوچو ۔ سمجھو ۔ اور غور کرو ۔

میں سپاہی ہوں مجھے حسن و ادا سے کیا غرض
بیوفا سے کیا تعلق باوفا سے کیا غرض
اک دل وحشی کو طرز دلربا سے کیا غرض
گیسوئے خمدار و چشم فتنہ زا سے کیا غرض
عشق بے ہنگام کا انجام بدنامی نہ ہو
ڈزڈ مونا کی طرح آخر میں ناکامی نہ ہو

زبیدہ ۔ اف ری بیدردی ایک جائز دوفا شعار بی بننے کیلئے میرے غرور نے تمہارے آگے سر جھکایا مگر تم نے اُسے حقارت سے ٹھکرا دیا ۔

ملایا خاک میں تم نے مرے جذبات پنہاں کو ۔
جلایا دل کو سینہ کو جگر کو جسم کو جاں کو
جفا کے نشتروں سے بیوفا مجروح کر ڈالا
محبت کو وفا کو شوق کو حسرت کو ارماں کو

شاہنواز ۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ آپ دلفریب شاعری کو بیمحل استعمال کر رہے ہیں ۔ اگر کسی حسن پرست شاہزادے کے سامنے آپ اپنی فصاحت و بلاغت سے اظہار مدعا کریں تو وہ قدر محبت اس قدر تو کم سے کم کرتا

کہ اپنے تاج والے سر کو ان قدموں پہ خم کرتا
یہ مانا آپ بہتر حسن میں ہیں سب زمانے سے
مگر کیا فائدہ اندھے کو آئینہ دکھانے سے

زبیدہ ۔ شاہنواز بہت زیادہ میرے حسن کی توہین اور میرے درخواست کی تحقیر ہو رہی ہے کیا تم پر کچھ اثر نہیں ہوتا ۔

شاہنواز ۔ ہاں میرے دل کو میدان جنگ کے خونی نظاروں نے پتھر بنا دیا اسمیں قبول محبت و عشق کی قابلیت نہیں رہی

رہے جنگل میں جو وہ کیا کریگا قدر باغوں کی
کھلی رہتی ہیں کلیاں سامنے زخموں کی داغوں کی
جلاؤ شمع حسن اس میں کہ جس گھر میں اندھیرا ہو
کہیں بھی چاندنی میں قدر ہوتی ہے چراغوں کی

زبیدہ ۔ یہ بیمروتانہ جواب ہے

شاہنواز ۔ اپنے فائدہ کے لئے آپ کی مرضی کے خلاف جواب دینا کوئی بیوفائی نہیں ۔

زبیدہ ۔ سن او غارت گر رسم وفا سن جب تو بستر بیماری پر لاش کی طرح بےحس و حرکت پڑا ہوا تھا اور آتش زدہ جہاز کے زخموں کی تکلیف سے آخری سانس کا انتظار کر رہا تھا اوس وقت او بیمروت اس وقت میں نے تیرے بدبودار زخموں کو اپنے ہاتھوں سے دھو دھو کر مرہم لگایا ہے کیا اتنی جلد بھول گیا ۔

سہارا میرا جسم نازنین تھا راہ چلنے میں
مدد دیتے تھے میرے ہاتھ کروٹ کے بدلنے میں
بہت کم وقت باقی رہگیا تھا دم نکلنے میں
نہ تھا ہاتو نہ کچھ قابو کف افسوس ملنے میں

ذرا سن وہ بھی تو اک وقت تھا بیدادگر تیرا
مرے ہاتھوں میں تیرے ہاتھ تھے زانو پہ سر تیرا

شاہنواز۔ خاک تو میری تیمارداری سچی ہمدردی انسانی نہ تھی آہیں اک خود غرضی کا راز تھا۔

اب وہ خود غرضی نمایاں بن کے رسوائی ہوئی
کرتی ہر عرض ندامت آنکھ شرمائی ہوئی
مارنے کے واسطے زندہ کیا تو کیا کیا
قتل کرنے کو جلایا کیا مسیحائی ہوئی

زبیدہ۔ افسوس میں کیا جانتی تھی کہ اپنے باپ کی تعمیل حکم کر کے اتنی ذلتیں اٹھانا پڑیں گی۔

شاہنواز۔ ہاں ہاں تم اکیلی اس معاملہ میں قابل ملامت نہیں تمہارا باپ بھی ہے۔

زبیدہ۔ احسان فراموش میرے باپ نے کیا قابل ملامت کام کیا۔

شاہنواز۔ اُس نے جوانی کے نشہ میں بدمست لڑکی کو ایک اجنبی جوان کی آغوش میں ڈھکیل دیا اس سے زیادہ غلطی کیا ہو سکتی ہے رکھدیا کیوں دانہ بارود انگارے کے پاس

آگ کو رکھتے نہیں عاقل کبھی پارے کے پاس
عمر بھر پچھتائے گا اس طرح کا ناداں طبیب
جس نے بٹھلایا ہو مستسقی کو فوارہ کے پاس

زبیدہ۔ تو اس سے کیا ہوا۔

شاہنواز۔ اس سے یہ ہوا کہ محبت وعشق کے طوفانی موجوں نے قلعۂ عصمت کی بنیاد کو جڑ سے ہلا دیا اور اگر میں چاہتا تو اسیوقت تمہاری دامن عصمت کی دھجیاں کر کے ہوا میں اُڑا دیتا۔

زبیدہ۔ زبردستی بغیر رضامندی۔

شاہنواز۔ اوہ عورت کی رضامندی کو کتنی دیر لگتی ہے ناپاک بوسکی ایک چنگاری دامن عصمت کے ساتھ وہ سلوک کرتی ہے جو ایک چنگاری تمام خرمن کے ساتھ۔

تجھ میں جذبہ مجھ میں طاقت تجھ میں خواہش مجھ میں جوش
مرد اگر چاہے تو عورت دم میں ہو عصمت فروش
عشق کی طاقت سے کوئی آج تک جیتا نہیں
میں کوئی یوسف نہیں ہوں تو کوئی سیتا نہیں

زبیدہ۔ اچھا شاہنواز خدا حافظ۔ مگر ہاں کیا میں یہ اُمید کروں کہ آج کی رات کے واقعات تم بھول جاؤ گی۔

شاہنواز۔ بانو اطمینان رکھو یہ راز مرتے دم تک میرے سینہ میں دفن رہیگا۔

دونوں اپنی اپنی طرف جاتے ہیں

شاہنواز۔ (زبیدہ کو روک کر) خاتون معظمہ ذرا صبر کیجئے آپ نے اپنے احسان کی یاد دلا کر میرے دل پر نشتر لگایا ہے اس لئے میں گھٹنے ٹیک کر معافی کا خواستگار ہوں کہ اپنی ذات کو محفوظ رکھنے کے لئے میں نے اگر گستاخانہ مقابلہ کیا ہو تو آپ اسے معاف فرمائیں گی۔

(گھٹنے تک جھکتا ہے اور زبیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بوسہ لیتا ہے یعقوب جو آڑ سے دیکھ رہا ہے اس کو بدگمانی ہوتی ہے کہ شاہنواز میری لڑکی کو بہکا رہا ہے وہ مغلوب الغضب بڑا غصہ میں بھرا ہوا داخل ہو کر شاہنواز کو گردن سے پکڑتا ہے)

یعقوب۔ شیطان وبائی کیڑوں کی طرح شریف انسانوں کے خون میں زہر پھیلانے والے سیاہ کاژ قزاقوں کی طرح گناہ نیم شبی کے مرتکب بتا احسان فراموش یہ سب کیا تھا اور میری آنکھوں نے کیا دیکھا۔

زبیدہ۔ ابا جان

یعقوب۔ خاموش بدچلن لڑکی خاموش۔

زبیدہ۔ حضور

یعقوب۔ ایک لفظ نہیں

شاہنواز۔ میرے محسن آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے خوفناک غلط فہمی

یعقوب۔ روز روشن میں طلوع آفتاب سے انکار کرکے تو اپنی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔

شاہنواز۔ جناب غصہ کرنے سے پہلے معاملہ سمجھنے کی ضرورت ہے

یعقوب۔ نجس کتے میرے مکان کی در و دیوار کو ہوس پرستی کی ناپاک سانسوں سے دوزخ بنانے والا کیا تو نہیں۔ ایک فرشتہ خصلت لڑکی کی عصمت کو گندے عشق کے جذبات سے مجروح کرنے والا کیا تو نہیں۔

شاہنواز۔ ذرا مجھے چھوڑئے مجھے واقعات صحیح بیان کرنیکا موقع دیجئے

یعقوب۔ کبھی نہیں ترا گلا تر اگریبان میرے ہاتھ سے اس وقت تک نہیں چھوٹ سکتا جب تک تو لاش ہوکر میرے قدموں پر نہ گر پڑے۔

شاہنواز۔ (ہاہاہاہا) دہوکا، میرے محسن غلط فہمی، وہم، شک بدگمانی،

شاہنواز۔ ہنستا ہے بے غیرت شرم کر۔

شاہنواز۔ میں ہنستا ہوں اور اس لئے ہنستا ہوں کہ ایک کمزور بوڑھا جسکو موت طفل شیر خوار کی طرح گود میں لئے پھرتی ہے ایک مشہور بہادر نبرو آزما کو کتے کی طرح جھنجوڑیاں دے رہا ہے اور وہ پاس احسان سے کچھ نہیں کہتا۔

یعقوب۔ کہہ اگر تیری زبان میں شریفانہ جنبش اور تیرے ضمیر میں اخلاقی طاقت ہے تو کہہ۔

شاہنواز۔ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے مجھے جلتے ہوئے جہاز اور ابلتے ہوئے سمندر سے نکال کر زندگی کے محفوظ کنارہ پر پہونچایا ہے اس لئے میرا شریف دل اجازت نہیں دیتا کہ اس بزدل گستاخی کا انتقام لوں۔

کیا کروں میں ہاتھ محسن پر اٹھا سکتا نہیں
گالیاں سنتا ہوں لیکن سر اٹھا سکتا نہیں
شرم سے خون شرافت کا رگوں میں جوش ہے
دل بہت بے چین ہے لیکن زباں خاموش ہے

یعقوب۔ مکر پیشہ، روباہ خصال، تو خوشامد سے مجھے خوش نہیں کر سکتا۔

شاہنواز۔ بس بہت ہوچکا ایک سپاہی کے سینہ میں مغرور دل ہوتا ہے زیادہ سخت گیری مجھے گنا ہگار نہ بنادے میں التجا کرتا ہوں کہ میرا گریبان چھوڑ دیجئے بس چھوڑ دیجئے۔

یعقوب۔ دہمکی، احسان کے بندے، مہربانی کے محتاج میرے رحم پر جینے والے۔ میں ان دہمکیوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

شاہنواز۔ آخری التجا ہے کہ تم ہوش میں آجاؤ ورنہ مجھے سزا دینے کی ضرورت پڑے گی۔

ایک مشت استخواں کا نعرۂ پرشور کیا
تم ہو کیا اور یہ تمہاری ہستیِ کمزور کیا
دل نہ روکے گر غضب کی آندہیاں چلتی ہوئی
کاٹ ڈالوں تیغ سے منہ میں زباں چلتی ہوئی

یعقوب۔ محسن کش احسان فراموش کیا یہی تیرا فرض تھا۔

شاہنواز۔ صاحب میں اپنا فرض نہیں بھولا۔ مگر آپ نے اپنا فرض بھلا دیا۔

یعقوب۔ میں نے اپنا فرض بھلا دیا وہ کیونکر۔

شاہنواز۔ وہ یہ کہ آپ کا فرض تھا کہ اپنی جوان لڑکی کو ایک نوجوان کی صحبت سے بچاتے، مگر ایسا نہیں ہوا

کیوں نہ اس احمق کو ہوں رنج و بلا کے سامنے
شمع روشن کرکے جو رکھدے ہوا کے سامنے
باپ بیٹی کی حفاظت کرنے والا چاہئے
جس خزانہ میں ہو دولت امین تالا چاہئے

یعقوب کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے میری غلطی سے فائدہ اُٹھایا۔

شاہنواز۔ یہ دوسری غلطی ہے

یعقوب۔ یعنے

شاہنواز۔ یعنی میں بیگناہ ہوں خدا اور اس کے فرشتے انسان حیوان، نباتات، جمادات ــــــ حشرات ہاں یہ صحن عالم کا ایک ایک ذرہ شہادت دیگا کہ شاہنواز کا دامن ہوس پرستی کی نجاست سے پاک ہے۔

خون کیا دنیا اگر ہو دشمنِ جانی مری
صورت یوسف ہی ثابت پاکدامانی مری

یعقوب۔ گناہ پر گناہ ناپاک گناہ شرمناک گناہ میری رسوائی کے زندہ اشتہار تو اس گھر کی چار دیوار کے باہر نہیں جاسکتا۔ میں تیرے منہ پر موت کا قفل لگاؤنگا۔

شاہنواز۔ کس کی مجال ہے

یعقوب۔ زبان دراز لے اور قیامت تک کے لئے خاموش ہوجا۔ (ریوالور چلاتا ہے ریوالور پھٹ جانے سے گولی پیچھا کرتی ہے یعقوب مردہ ہوکر گرتا ہے)

شاہنواز۔ (لاش کو غور سے دیکھکر) مرگیا۔

زبیدہ۔ کس نے مارا۔

شاہنواز۔ انصاف و قدرت کے زبردست ہاتھ نے

زبیدہ۔ شاہنواز قسمت نے راستے کی ٹھوکر دور کردی کیا تم اب اپنا خیال بدل دوگے۔

شاہنواز۔ بیحیا عورت آخر یہ تیرا باپ تھا۔

زبیدہ۔ مگر ایسا باپ جو اولاد کی ارمانوں کا خون کرنے والا۔

شاہنواز۔ صدمۂ مرگ پدر اد بیوفا کچھ بھی نہیں

دل میں رحم اور آنکھ میں شرم و حیا کچھ بھی نہیں
ناخلف اولاد تو ہے باپ کے مرنے سے خوش
تجھ سے اب دنیا کو امید وفا کچھ بھی نہیں

زبیدہ۔ وہ تمھارا دشمن تھا اسلئے میں اسکی دشمن تھی۔ کہو اب کیا جواب ہے

شاہنواز۔ جواب صاف

زبیدہ۔ اونا انصاف عورت کی فطرت جتنی بھولی ہوتی ہر مکاری میں اتنی ہی بیباک بھی ہوتی ہے۔

شاہنواز۔ اس دھمکی سے کیا مطلب ہے

زبیدہ۔ مطلب مطلب یہ کہ میرے باپ کو قتل کرکے تو زندہ نہیں بچ سکتا۔

شاہنواز۔ کیا تو مجھ پر اس خون کا الزام رکھے گی۔

زبیدہ۔ بیشک قطعی

شاہنواز۔ کچھ پروا نہیں چڑیل عورت میں تیرے مکر سے تیرا غلام نہیں بن سکتا

زبیدہ۔ ہاں تو لو۔ ارے دوڑو خدارا دیکھو اس شیطان نے میرے باپکو جان سے مارا

(سپاہیوں کا داخلہ شاہنواز کی گرفتاری۔)

احسن لکھنوی

فلسفۂ مذہب

(بسلسلۂ گزشتہ)

مذہب اور قومیت بس دنیاوی معاشرت میں مذہب کا مخل ہونا یا تو ایک احسان وقتی ہوگا اور یا پھر فضول ولایعنی، اگروہ اس کی ابدیت اور عمومیت پر اصرار کرے۔ کیونکہ اس کی پابندی صرف ایک ہی مخصوص قوم سے ایک ہی زمانے میں ہوسکتی ہے اور ایسی صورت میں مذہب صرف ایک دنیاوی قانون و رسوم کی صورت اختیار کرکے قومیت کا مرادف بنجاتا ہے اور جب مذہب قومیت کی جگہ لے لیتا ہے تو قومیت کی لعنت المضاعف ہوجاتی ہے۔ فلسفی شیراز سعدی نے بالکل ٹھیک کہا ہے

"ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ"

مسلمان میری اس تحریر پر آپے سے باہر نہ ہوں بلکہ خود قرآن سے اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ نماز روزہ اور زکوٰۃ اسلام کے رکن عظیم ہیں۔ قرآن نے اُن کو بجا طور سے فرض کیا ہے کہ یہ اعتقاد صالح کی عملی صورت ہے۔ ہر انسان پر تین حقوق ہیں اور ان اعمال کی بجا آوری درحقیقت ان تین حقوق کی بجا آوری ہے نماز خالق کے حقوق کی بجا آوری۔ زکوٰۃ حقوق عباد اور روزہ حقوق نفس کی بجا آوری ہے۔ مگر یہ عجیب و دلچسپ بات ہے کہ ان کے عملی طریقوں کے لئے قرآن نے اس قدر اختصار و ابہام سے کام لیا ہے کہ سوائے اُس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ قرآن کا مقصد صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کے سامنے اسلام پیش کرنے کا ہے۔ اور خدا جانتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں کے طبائع ایسے واقع ہوئے ہیں کہ ان پر ایک مخصوص زبان و طریقے کے ساتھ عبادت تکلیف مالا یطاق سے کم نہ ہوگی اور اگر وہ بجا بھی لائیں گے تو بغیر رجوع قلب کے۔ ارکٹک کا رہنے والا اسکیمو جو برف کے مکان اور نصف سال کی رات میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ یقیناً عرب کے طریقہ پر عبادت کرنے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے معذور رہے۔ اس لئے قرآن کا صاف و صریح منشا عملی طریقوں پر سکوت اختیار کرنے کا یہی تھا کہ عبادت محض خدائے واحد کی ہو کیونکہ وہ مذہب کا ایک رکن عظیم ہے۔ خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو۔ اس خیال کی تائید خود قرآن کی ان آیتوں سے ہوسکتی ہے۔

(۱) ان الذین آمنوا والذین ہادوا والنصاریٰ والصابئین والمجوس من آمن باللہ وعمل صالحاً فلاخوف علیہم ولاہم یحزنون

(۲) لکل امۃ جعلنا منسکاً ہم ناسکوہ فلاینازعنک فی الامر وادع الی ربک انک لعلیٰ ہدی مستقیم

(۳) قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولانشرک بہ شیئاً ولایتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشہدوا بانا مسلمون۔

برخلاف اس کے دنیاوی و معاشرتی احکام جن کا مقصد عربوں کو اصول تمدن سکھانے کے سوا دوسرا نہ تھا مثلاً طلاق۔ وراثت وحجاب واعتاق ومکاتبت وغیرہ۔ ان کی نسبت قرآن نے کافی وضاحت سے کام لیا ہے۔ لہذا قومی مذہب ایک قومی شریعت کیساتھ

عمومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کبھی وہ ایک قوم سے باہر پھیل سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ سب مل کر خود ایک علٰحدہ قوم نہ بنجائیں۔ اور اگر یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اس وقت کے عرب عموماً سوتے وقت اپنے سارے کپڑے اُتار کر برہنہ سوتے تھے اور اس زمانے کی عرب کی عورتیں بالکل اسی طرز پر رہتی تھیں جیسا کہ موجودہ زمانے کی بدوی عورتیں دیکھی جاتی ہیں۔ اُن کو پیروں میں جھانجھ یا پازیب پہننے کا شوق تھا اور اس کے ساتھ وہ اپنا سینہ کھلا رکھتی تھیں۔ اب دیکھو اگر قرآن کا ہر ایک حکم ہر زمانے اور ہر قوم پر فرض سمجھا جائے تو ان احکام کی تعمیل کہ کسی کے سوتے وقت بلا اذن اس کے خلوت میں نہ جاؤ۔ یا عورتوں کے لئے جب وہ چلیں تو اپنے پازیبوں میں آواز پیدا کرتی ہوئی نہ چلیں اور اپنے سینوں کو دوپٹوں سے بند رکھیں، اُن قوموں کے لئے جن کی یہ قومی عادتیں نہیں ایک فضول حکم ہوگا۔ اسی پر وضو و طہارت کے دوسرے احکام کو قیاس کر لو۔ اسی اصول سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ شریعت اسلامی میں۔ چوری زنا۔ قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں اُن میں کہاں تک عرب کے رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ موجودہ صورت میں اختلاف زمانہ کے لحاظ سے کہاں تک اجتہاد کی گنجائش ہے۔

غالباً حضرت شاہ ولی اللہ نے متاخرین میں سے اس نکتہ کو ایک حد تک سمجھا ہے۔ چنانچہ وہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ولہذا المعنی اختلف شرایع الانبیاء۔ والراسخ فی العلم یعلم ان الشرع لم یجی فی النکاح والطلاق والمعاملات والزینۃ واللباس والقضاء والحدود ـــــ بما لم یکن لہ بہ علم او تیر ددون فیہ اذا کلفو بہ انما وقع افامۃ المسموع والصحیح السقیم

اور اسی وجہ سے انبیاء کی شریعتیں مختلف ہیں اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح۔ طلاق و معاملات آرائش۔ لباس۔ قضا و تعزیرات وغیرہ میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کی جسکو وہ لوگ پہلے سے نہ جانتے ہوں یا ایسے مسئلے جن کو قبول کرنے میں ان کو پس و پیش ہو۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جو کجی تھی وہ سیدھی کر دی گئی اور جو خرابی تھی رفع کر دیگئی۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

آگے پھر فرماتے ہیں۔

فکذالک یعتبر فی الشرائع علوم مخزونۃ فی القوم واعتقادات تجاری فیھم ولذالک نزل تحریم اللحوم لابل والبانہا علی بنی اسرائیل دون بنی اسمٰعیل ولذالک کان الطیب والخبیث والمطاعم مفوضاً الی عادات العرب ولذالک حرمت بنات الاخت علینا دون الیہود

اسی طرح شریعت میں ان علوم و اعتقادات و عادات کا لحاظ کیا جاتا ہے جو قوم میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا اور بنی اسمٰعیل پر حرام نہ ہوا اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہود کے ہاں نہیں ہے۔

اسی بحث میں آگے چلکر لکھتے ہیں۔

واعلم ان کثیرا من العادات والعلوم الکامنة یتفق فیہا العرب والعجم وجمیع سکان الاقالیم المعتدلة واہل الامزجة القابلة لاخلاق الفاضلة کالحزن لمیتہم والاستحباب الرفق بہ کالفخر بالاحساب والانساب فتلک العادات والعلوم احق الاشیاء بالاعتبار ثم بعدہا عادات وعقاید تختص بالمبعوث علیہم فتعتبر تلک ایضا

جاننا چاہئے کہ بہت سے مراسم اور علوم ایسے ہیں جن میں تمام عرب وعجم اور تمام معتدل ممالک کے رہنے والے اور تمام وہ لوگ جن میں اخلاق فاضلہ کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے سب متفق ہوئے ہیں مثلاً مردہ کا غم کرنا اور ان پر رحم کھانا یا مثلاً حسب ونسب پر فخر کرنا تو یہ مراسم اور یہ اصول سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں ان کے بعد وہ مراسم ہیں جو خاص اسی قوم میں جاری ہیں جس پر وہ پیغمبر مبعوث ہوا ہے تو ان مراسم کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے اس کی شریعت میں اس قوم کے عادات اور خصوصیات کا خاص طریقے پر لحاظ ہوتا ہے لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہو اس کے طریقہ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا کیونکہ نہ تو وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے اور نہ تمام قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہوسکتی ہیں۔ اس لئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم وتلقین شروع کرتا ہے اور آپ کو محاسن اخلاق کا نمونہ بنا دیتا ہے اور یہ قوم اس کے اعضا اور جوارح کا کام دیتی ہیں اور اسی کے نمونے پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر قواعد اور اصول عام ہوتے ہیں جو قریباً تمام دنیا کے لوگوں میں مشترک ہوتے ہیں تاہم اپنی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کے بنا پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ اسپر چنداں زور دیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۲۳ میں اس اصول کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

وہذا الامام الذی یجمع الامم علی ملة واحدة تحتاج الی اصول اخری غیر الاصول المذکورة فیما سبق منہا ان یدعو قوما الی السنة الراشدة ویزکیہم ویصلح شانہم ثم یتخذہم بمنزلة جوارحہ * * * وذالک لان ہذا الامام نفسہٗ لا یتأتی منہ مجاہدة امم غیر محصورة واذا کان کذالک وجب ان یکون مادة شریعتہ ما ہو بمنزلة المذہب الطبعی لاہل الاقالیم الصالحة عربہم وعجمہم ثم ما عندہ قومہ من العلم والاتفاقات ویراعی فیہ حالہم اکثر من غیرہم ثم یحمل الناس جمیعاً علی اتباع تلک الشریعة لانہ لاسبیل الی ان یفوض الامر الی کل قوم او الی ائمة کل عصر ان لا یحصل منہ فائدة التشریع

یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے اس کو اور چند اصول کی "جو اصول مذکورۂ بالا کے علاوہ ہیں" حاجت پڑتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہے اس کی اصلاح کرتا ہے اسکو پاک بناتا ہے . . .

یہ اس لئے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے اس لئے ضرور ہوا کہ اس کی شریعت کی اصلی بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب وعجم کا فطری مذہب ہو اس کے ساتھ خاص اس قوم کی عادات اور مسلمات کے اصول بھی لئے جائیں اور انکے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر

اصلاً ولا الی ان ینظر ماعند کل قوم و یمارس کلا منہم فیجعل لکل شریعۃ فلا احسن ولا ایسر من ان یعتبر فی الشعائر والحدود والارتفاقات عادۃ قومہ المبعوث منہم فلا یضیق کل التضییق علی الاخرین الذین یاتون بعد"

تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوا ئے قوم کو اجازت دیجائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں (مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں مصنف) ورنہ تشریع محض بیفائدہ ہوگی - یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادت و خصوصیات کا تجسس کیا جائے - اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی طریقہ نہیں کہ شعائر تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادت کا لحاظ کیا جائے جس میں امام پیدا ہوا ہے اسکے ساتھ آنیوالی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے -

اب دیکھنا چاہئے کہ مذہب کے اصول و فروع کیا ہیں اور مذہب کا تعلق قومیت و حکومت سے کہاں تک ہے اور مذہب کی عملی پیروی سے قومیت پر کیا اثر پڑتا ہے - ہم اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لئے پہلے ایک شجرہ ترتیب دیتے ہیں اور پھر اس کی تشریح کریں گے -

مذہب اسلام

- عبادات (نبوت)
  - ایمان: خدا، نبوت، حشر و نشر وغیرہ
  - عمل صالح: نماز، روزہ، زکوٰۃ، اوامر، مناہی
  - اخلاق
- معاملات (سلطنت یا خلافت)
  - احکام دیوانی مثل وراثت نکاح مہر - طلاق - بیع و شرا
  - تعزیرات
  - جہاد
  - سیمیات: جمعہ و عیدین ختنہ و عقیقہ - طریقہ معاشرت و طہارت ماکولات

یہ صحیح ہے کہ مذہب بغیر سلطنت کے ایک فلسفہ ہے اور اس بنا پر میں نے مذہب کے ماتحت عبادات و معاملات کی دو شاخیں نکالی ہیں جنمیں ایک قابل تبدیلی ہے، حسب حال زمانہ و قوم - اور دوسرا ازلی - یا یوں کہئے کہ ایک کا تعلق نبوت و روحانیت سے ہے اور دوسرے کا مادیت اور سلطنت سے - اس لئے مذہب کے معنی درحقیقت نہایت وسیع ہوئے یعنی انسان کا ہر فعل ایک طور سے مذہب کے ماتحت آجاتا ہے - خود مذہب کے لفظی معنے سے یہی مطلب نکلتا ہے جس کا مادہ ذہب ہے جس کے معنے چلنے کے ہیں یعنی انسانی روش و طریقے - نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کی مختصر تعریف "علم" ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ "کافر" یا مذہب سے بیگانہ کے لفظی معنی عربی میں وہی ہیں جو انگریزی لفظ (Pagan) یا (Heathen) کے ہیں کافر جس کی جمع کفار ہے اس کے بھی معنی کاشتکار

وکسان و دیہاتی کے ہیں قرآن میں ہے کمثل الغیث یعجب الکفار ـــــ عربی میں کسی دیہات کو کہیں گے کفر فلاں یعنی فلاں قریہ اور یہی
معنے انگریزی الفاظ کے ہیں تو گویا کافر یعنی غیر مسلم ایک اجڈ بے علم دیہاتی ہے۔ اس کے برخلاف ایک مومن یا مسلم ایک تعلیم یافتہ مہذب شہری ہوا
اور یہ ہمارے پہلے قول کی تائید ہے کہ وحشیوں کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں مختصر یہ کہ "بے علم نتواں خدا را شناخت"۔

ایک پیغمبر جب کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو وہ قوم دنیاوی حیثیت سے متمدن ہے۔ اور اس صورت میں پیغمبر صرف مجدد روحانی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو شریعت و حکومت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جیسا مسیح کی نبوت اور اگر وہ قوم بالکل ہی وحشی ہے تو نبوت نہ صرف روحانی تعلیم کے لئے ہوتی ہے بلکہ شریعت و حکومت بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے آخری صورت میں قوم کی اصلاح بذریعہ نبوت اس طرح شروع ہوتی ہوگی۔ کہ پہلا کام جو نبی کریگا یہ ہوگا کہ وحشی کو بتلائے کہ فلاں کام اچھا ہے۔ فلاں کام بُرا ہے اور وحشی کو اس وقت ایک اچھے کام کی رغبت اور دوسرے سے نفرت ہوگی جب ایک کے کرنے پر اس کو انعام ملیگا یا کم سے کم اگر انعام نہ ملیگا تو دوسرے کے کرنے پر اس کو عقوبت ضرور دیجائیگی اس تمیز کے لئے نبی کو تعزیرات و حکومت سے کام لینا پڑا ہوگا۔ اور یہ صورت اس وقت تک کے لئے کافی ضمانت ہوگی جب تک وحشیوں کی صرف ایک مختصر جماعت ہو تاکہ نبی اس کے ہر فعل کی نگرانی کر سکے۔ لیکن فرض کرو کہ جماعت عظیم ہے اور مختلف فرقوں میں منقسم ہے۔ ایک وحشی چھپ کر بُرائی کرنے کا اکثر موقع پاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ خاموشی سے بنی ہم جنس کی نہیب و غارت کو اس کو عقوبت سے بچائے رکھے گی یا اگر کسی طرح نبی کو اس کی خبر ہوگی تو وہ جاکر ایسی جماعت میں شامل ہو جائیگا جو نبی کے دسترس سے باہر ہو۔ جب نبی نے دیکھا کہ وحشی کو برائی سے روکنے کے لئے اس کی دنیاوی تعزیر کافی نہیں ہوئی تو لامحالہ وہ ایسی تدبیر سوچیگا جس کے ذریعہ سے وحشیوں کے قلوب موثر ہوں اور اُن کو خود بخود بدی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت ہو۔ تو ہم نے دیکھا کہ پہلے وحشی کو سمجھانا کہ فلاں کام اچھا ہے اور فلاں کام بُرا ہے۔ کافی نہ ہوا۔ اس کے بعد اچھے کام پر انعام اور بُرے کام پر عقوبت بھی کافی نہ ہوئی اب تیسری صورت اگر باقی ہے تو یہی ہے کہ خود بدی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت اسکی طبیعت ثانیہ بنا دی جائے اور یہیں سے اصل مذہب کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر ان سب کا مقصد وہی ایک ہے یعنی دنیا میں امن و سلامتی اور بقائے قوم ہے۔

ہم یہاں پر یہ بحث کرنا نہیں چاہتے کہ صاحبان بصیرت و ارباب نبوت نے کس طرح اپنی قوموں کو خدا شناسی کی تعلیم دی اور ان کو یقین دلایا کہ موت کے بعد ان کی زندگی پھر قائم ہوگی اور خدا ان کو پچھلے اعمالوں کی سزا دیگا۔ مگر اس تلقین کا مقصد ظاہر ہے کہ سوا اسکے کچھ نہیں کہ جو باتیں حکومت و تعزیرات دنیوی سے حاصل نہ ہوں وہ اس صورت ـــــ سے حاصل ہو جائیں۔ شائد ابتدا ہی میں خدا کو ایک خدا سمجھنا اس قدر ضروری نہ رہا ہو جتنا اُس کو موت کے بعد حشر و نشر سزا و جزا پر قادر سمجھنا کہ یہ خطرہ ایک وحشی کو نیکیات کے جامے میں لانے کے لئے سب سے زیادہ موثر سبب بنجاتا ہے۔ جب وحشی کے دل میں اس خیال سے خشیت پیدا ہوئی تو وہ بُرائی کرنے پر ل ہوا پھر اس خیال کے راسخ ہونے کے لئے نفسیات کے عام اصول پر متواتر عمل صالح کی تلقین کی گئی جس کا طبعی نتیجہ نیکی سے انتساب اور بدی سے احتراز ہے اور یہی اصل مذہب ہے۔ اس لئے مذہب اور حکومت کا تعلق چولی دامن کا سا ہے اور جس طرح مذہب حکومت کا عصا ہے۔ اسی طرح حکومت کا عصا مذہب ہے۔ لیکن جتنے مذاہب دنیا میں اسوقت ہمارے سامنے ہیں انمیں صرف

اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ باوجودیکہ اس نے اپنے ابتدائی نشو ونما میں قومی مذہب کی صورت اختیار کی۔ قرآن نے اس کو واضح کر دیا کہ اصول مذہب کی حیثیت سے وہ عالمگیر مذہب ہے اور یہ دعویٰ سب سے پہلے اسلام ہی نے کیا۔

مسلمان کوئی قوم نہیں بلکہ وہ ایک مذہب کی پابند جماعت ہے۔ قوم ہونے کی حیثیت سے ہم کو ہموطن غیر مسلم قوم کی معاشرت سے جدا معاشرت قائم نہ کرنا چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خیال اب موجودہ ترکی ومصر وشام میں جاگزیں ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے ہندوستان کے مسلمان ابھی تک ایک علیحدہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ ورنہ اگر شرک وبت پرستی کو علیحدہ کر لیا جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی ہولی ودیوالی ودسہرہ کو قومی تہوار ومراسم سمجھنے یا گائے کے گوشت سے احتراز کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا عرب کے مسلمانوں کو ختنہ وعقیقہ وحج وعیدین کے مراسم بجا لانے اور سور کے گوشت سے پرہیز، یا عجم کے مسلمانوں کے جشن نوروز کے منانے میں، خلفاے عرب سے نفرت کرنے کا۔ جس مذہب نے قومیت وقومی شعار کو مذہب سے علیحدہ رکھا ہے وہ دنیا میں نہ صرف تبلیغی حیثیت سے بلکہ مادی طریقہ سے برسرِ ارتقا ہے اور جو کسی قسم کی تبلیغی یا مادی ترقی سے محروم ہے وہ وہی مذہب ہے جو قومیت کے مرادف ہو گیا۔ لوگوں کا یہ غلط خیال ہے کہ مذہب دنیا میں سب سے زیادہ خونریزی کا باعث ہوا ہے وہ مذہب نہیں ہے۔ بلکہ قومیت کی ایک صورت ہے۔

خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہوا کہ تمام وہ باتیں جن کا اثر ہر قوم وہر زمانے میں عام نہیں وہ سب مذہب کے فروع ہیں اور اس میں احکامات دیوانی وفوجداری وجہاد۔ قومی مراسم بلکہ طریقۂ عبادات بھی شامل ہیں۔ مذہب کی عملی پابندی کے لئے اگر ایک شریعت ضروری ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے اندر ہر قوم وہر زمانے میں ابوحنیفہ پیدا ہوا کریں جو اپنے ملکی حالات ومعاشرت کو پیش نظر رکھ کر اجتہاد کریں۔ مگر پہلی صدی ہجری کے ائمہ کے قیاسات مذہب کے عام اصولوں کے ساتھ دوامی سمجھنا اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے بہت بُرا ہے اور خود "قوم" اسلام کی دنیاوی ترقی کا سدباب ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے جس کا خمیازہ ہم نے اب تک اُٹھایا ہے یورپ کی نشست وبرخاست ولباس اور عرب کے نشست وبرخاست ولباس میں زمین آسمان کا فرق ہے عرب اپنی مسجد میں زمین پر بیٹھکر آسانی سے عبادت کر سکتا ہے مگر یورپ کرسی کا عادی ہے۔ کیوں نہ یورپ کا ابوحنیفہ عبادت کا طریقہ ان کے عادت کے موافق اجتہاد کرے جب کہ قرآن نے مصلحتاً اس میں سکوت اختیار کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قرآن نے اوقات نماز کی تعیین اس خوبی سے کی ہے کہ اگر ہم حدیث کی مدد نہ لیں تو ہم یورپ کے لئے صرف تین وقت کی نماز متعین کر سکتے ہیں ——— کیونکہ ظہر ومغرب کی نماز کی کہیں صراحت نہیں کی گئی عرب جو اپنا بیشتر وقت قہوہ خانوں کی گپوں میں صرف کرتے ہیں وہ پانچ نہیں بلکہ پچاس وقت کی نماز پڑھیں تو بہتر ہے۔ مگر یورپ کے ایک مشغول کاروباری سے کہو کہ تم مغرب کے وقت جبکہ وہ اپنے کام سے راحت پاتا ہے یا ظہر کے وقت کوئی نماز ادا کرے اور اسی پر اس کے اسلام کا انحصار ہو تو وہ کیونکر اسلام کو فطری مذہب مان سکتا ہے۔ جب میں نے حدیث کی مدد سے قرآن کے سمجھنے کی کوشش کی تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا ——— کہ حدیث ہمکو یہودی بنا دیتی ہے اور قرآن ہم کو مسلم۔ اور اب مسلمانوں کو اختیار ہے خواہ وہ یہودی بنیں یا مسلم۔ صرف قرآن کی ایک آیت لیلو۔

ولا تطرد الذین یدعون ربهم بالغدوة والعشی یریدون وجهه ما علیک من حسابهم من شیءٍ وما من حسابک علیهم من شیء فتطردهم فتکون من الظالمین

اس کے مقابلہ میں آمین بالجہر اور رفع یدین پر تکفیر کے فتووں کو دیکھو کیا قرآن کا یہ قول ہم پر صادق نہیں آتا - ان قومی اتخذو قرآنا مہجوا
چونکہ ہمکو فلسفہ مذہب میں محض اصول مذہب پر بحث کرنی ہے ہمنے سوچا کہ اگر ہم ایک مذہب کا معیار مقرر کرکے اسپر بحث کریں گے تو بہترین معیار ہمارے لئے اسلام ہوگا - مگر اسی کے ساتھ یہ خیال بھی ہے کہ مذہب اسلام کے جزو اعظم یعنی معاملات کو کیونکر نباہیں گے - اس لئے ہمنے اس عنوان میں مذہب اور قومیت کی بحث کرکے اسلام کو ان مجہولات سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے جو غالباً بعض کے نزدیک بقول غالب -

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

اور بعض کے نزدیک بقول رومی "استخواں پیش سگاں انداختن" ہوگا

باقی .... باقی

سید مقبول احمد

اعلان

ہندوستانی ایکاڈیمی کو ایسے مترجموں کی ضرورت ہے جو انگریزی سے بامحاورہ اردو ہندی زبانوں میں ترجمہ کر سکیں -

مترجم ایکاڈیمی کے ملازم نہ ہوں گے - جو لوگ سائنس اور ادبی کتابوں کا ترجمہ کرنا چاہتے ہوں ان کو نمونے کیساتھ ۲۰ ؍ جون تک درخواست دینا اور شرائط طے کر لینا چاہیے -

(ڈاکٹر) تارا چند

جنرل سکریٹری ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد

چنگاری

(فسانہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

۹

یوسف کے قیام کو دارجلنگ میں ایک مہینے سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور روز ولا (کوٹھی) میں جو ایک مرتفع مقام کے بہترین کنج میں واقع ہے ٹھہرا ہوا ہے۔ مس گارڈن جس نے اپنی ساحرادائوں سے کام لیکر یوسف پر ایک قاہرانہ قبضہ قائم کر رکھا ہے، اس کی شب روز کی جلیس ہے اور ہر صبح شام کے لئے ایک جدید "لائحہ نشاط" مرتب کر کے یوسف کی شب بھر کی "خستۂ معصیت" روح میں نئی زندگی پیدا کر دیتی ہے۔

یوسف جس کی پیدایش اور تعلیم و تربیت نہایت ہی معصوم اور پاکیزہ ماحول میں ہوئی تھی اور جوان ہونے کے بعد بھی عرصہ تک یہی سمجھتا رہا کہ "سبیل راہ" کی طرح ساکت لیکن رہنمایانہ زندگی بسر کر دینا ہی عین مقصود حیات ہے، کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس عالم کے ماوراء بھی کوئی عالم ایسا ہو سکتا ہے، جو اس کی توجہ کو جلب کر سکے۔ مس ہلن سے ملنے کے بعد اول اول تو وہ صرف اس قدر سمجھ سکا کہ عورت کا وجود اس قدر زیادہ غیر ضروری اور دلچسپ وجود نہیں ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کی اہمیت روشن ہونے لگی، یہاں تک کہ مس ہلن کے سامنے اس نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور انتہائی شغف کے عالم میں اپنا وہ سب کچھ اس کے قدموں پر ڈالدینا چاہا جسپر ایک مرد ناز کر سکتا ہے، لیکن جب اس کو رد کر دیا گیا تو پھر یہ امر اس کے اختیار سے باہر تھا کہ وہ اپنی وسیع ہو جانے والی تمنائوں کو سمیٹ سکتا۔ شاہین جب کسی شکار کے لئے فضا میں بلند ہوتا ہے تو پھر اس وقت تک وہ نیچے نہیں آتا جبتک دنیا کوئی دوسرا طائر اس کے خواہش صید کو پورا کرنے والا نہ ملجائے۔ یوسف میں اس نوع کی خواہش پرواز مس ہلن ہی کو دیکھ کر بلکہ اسی کی ترکیبوں اور کوششوں سے پیدا ہوئی تھی پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ مس ہلن کا فریب شعیدہ کھانے کے بعد وہ چین سے بیٹھ جاتا، اس کے اندر آگ بھڑک چکی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر کوئی سمجھانے والا نہ ملا تو پھر اس کا جلکر خاک ہو جانا یقینی ہے۔

پھر چونکہ شباب کی سرکشی سرشند ہنانے جوش میں آ جانے کے بعد اس کی بصارت زائل کر دی تھی، اس کے دل و دماغ میں جیسا کہ ہمیشہ زہد و ورع کے ردعمل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اب صرف یہی ایک خیال جاگزیں تھا کہ دنیا کی لذت و نشاط کو کیونکر اپنے لئے مخصوص کر لیا جائے اس لئے عین اسوقت جبکہ وہ مس ہلن نہیں بلکہ صرف ایک عورت کے لئے بیتاب تھا، مس گارڈن کا ملجانا گویا سیلاب کے لئے ساحل کا ٹوٹ جانا تھا۔ کہ پھر پانی کی رو کا رخ متعین کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ الغرض وہ گرا اور بری طرح گرا، اگر کبھی وہ ہوش میں آتا بھی تو اُسے تکلیف ہوتی کہ کیوں "این و آن" کے خیال سے اس پر لطف خواب کی لذت کو تباہ کیا جائے

شباب بجائے خود ایک ایسا زبردست طوفان ہے کہ اس کو روکنے کی کوشش کرنا گویا فطرت کے رخ کو بدلنا ہے، چہ جائیکہ اس کی اعانت کے لئے حسن و شراب بھی موجود ہو کہ یہیں آکر صحیح معنے میں انسان کی مجبوری ثابت ہوتی ہے ——— دن گزرتے گئے۔ تعلقات قلب کی بندشیں قوی ہوتی گئیں، معصیت عادت میں اور عادات طبیعت ثانیہ میں بدلتی گئی، یہاں تک کہ دو مہینے کے اندر ہی یوسف کی قلب ماہیت ہو گئی اور سارے دار جلنگ میں اس سے زیادہ شراب خوار، اس سے زیادہ قمار باز، اس سے زیادہ جری رند باز (شاہد باز) اور اس سے زیادہ خوش ادا رقص کرنے والا کوئی اور نہ تھا، گویا تہذیب کلب کے تمام معیاری اخلاق اس میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے وہ یہاں ایک نواب کی حیثیت سے رہتا تھا اور نواب ہی کی طرح بیدریغ روپیہ صرف کر رہا تھا۔

ایک دن شام کو وہ پوری کیفیت شراب میں بیٹھا ہوا صرف حال کی لذتوں کو سرمایۂ حیات سمجھکر ان پر مسرور ہو رہا تھا کہ خادم نے حبیب کا کارڈ لاکر اس کو دیا۔

حبیب! حبیب!! اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد حبیب کے ساتھ اُس نے مس ہلن کو بھی ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے شاید کسی نہایت گہرے خواب سے بیدار ہو رہا ہے، اور اسی کے ساتھ جب مس ہلن کی تمام گزشتہ بے اعتنائیاں (جن کے بھلانے ہی کے لئے اُس نے یہ تمام کارگاہ نشاط قایم کی تھی) یاد آئیں، تو اس کی مردانہ غیرت و خودداری میں پھر ایک تحریک پیدا ہوئی اور اس نے کوشش کر کے اپنی حیرت، اپنی مسرت اور تمام ان کیفیات کو جن سے حبیب یا مس ہلن کو معلوم ہو سکتا کہ اسپر کوئی خاص اثر ہے، ضبط کیا اور نہایت ہی غیر متاثرانہ انداز سے اُس نے کھڑے ہو کر ان دونوں کی پذیرائی کی اور قریب کی کرسیوں پر بیٹھنے کی درخواست کر کے خود بھی بیٹھ گیا اور ہاتھ ملتے ہوئے مصنوعی تبسم چہرہ پر پیدا کر کے نہایت رسمی شکریہ تکلیف فرمائی کا ادا کیا اور میز سے سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر پیش کیا۔ دونوں متحیر تھے اور یوسف کے اس پر تکلف اور اجنبی طرز ملاقات کی کوئی تاویل نہ کر سکتے تھے۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد مس ہلن نے ایک خاص پندار اعتماد کے ساتھ چہرہ پر تبسم پیدا کر کے کہا "مسٹر یوسف یہ دیکھکر بہت خوش ہوئی کہ اب آپ کی صحت غیر معمولی طور پر شگفتہ نظر آتی ہے"۔ یوسف نے اس کے اندر چھپے ہوئے نشتر کی چبھن کو محسوس کیا اور حد درجہ مستغنی انداز سے بولا کہ "جی ہاں اس سے قبل موسیٰ پر بھی یہی گزرا تھا۔ کہ گئے تھے آگ لینے مگر ہاتھ آگئی پیمبری، مجھے کیا خبر تھی کہ کبھی "وہم" کا تعاقب کرنا بھی "حقیقت" تک پہونچا دیتا ہے"۔

یہ سنکر مس ہلن کے چہرہ پر غصہ کا سرخ رنگ دوڑ گیا، اس نے اگر نشتر کا استعمال کیا تھا تو جواب تیر سے دیا گیا۔ یوسف نے اسکو محسوس کیا اور نہایت اطمینان سے گفتگو کا رُخ اور لب و لہجہ بدلکر سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ مینے کافی جوش کے ساتھ آپ کی پذیرائی نہیں کی، لیکن اس سے یہ نہ خیال کیجئے کہ میرا دل مسرت سے خالی ہے۔ باور کیجئے میں حیران ہوں کہ آپ لوگوں کی اس زحمت کی تلافی کیونکر مجھ سے ممکن ہے"۔

یوسف کا یہ خشک انداز، یہ بے پروایانہ طریق پذیرائی اور اسی کے ساتھ گفتگو کا وہ طعن جس میں زہر سے زیادہ نفرت پنہاں تھی

ایک ایسا خلاف توقع انکشاف تھا کہ مس ہلن ششدر رہ گئی اور دیر تک کچھ سوچتے رہنے پر مجبور
دوہی دن کے قیام میں یوسف کی آزادی کے تمام حدود حبیب و ہلن پر روشن ہو گئے اور حبیب نے باوجود مس ہلن کی مخالفت کی آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ اس کو کسی طرح مجبور کر کے یہاں سے واپس کرنا چاہئے۔ ایک صبح گفتگو اسی ارادہ سے شروع کی گئی لیکن حبیب نے اسکی ابتدا ہی کی تھی کہ یوسف نے ایک ایسی ہنسی کے ساتھ جس میں نہایت قوی عزم شامل تھا کہا کہ "حبیب میں ابھی دارجلنگ نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اگر دارجلنگ چھوڑ دوں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ گھر واپس جاؤں اگر یہاں نہ رہوں گا تو پھر وہاں جاؤنگا جہاں اس سے زیادہ سامان دلچسپی میرے لئے مہیا ہو"

حبیب "کیا گھر میں اس سے زیادہ سامان دلچسپی فراہم نہیں ہو سکتے"

یوسف (بے اختیار ہنسکر) آپ پروفیسر ہو کر ہر مخاطب کو بچہ ہی سمجھنے لگے۔ کچھ اور ذکر کیجئے۔ دنیا میں ناصح بننا کوئی مستحسن فعل نہیں ہے کسی کو نصیحت کرنا، اس کو بیوقوف سمجھنا ہے اور آپ بیوقوف کو بھی بیوقوف کہیں گے تو اسے غصہ آجائے گا، یہی ہے انسانی دماغ کی سائکالوجی"

مس ہلن۔ نصیحت ہمیشہ دانشمند ہی کو کیجاتی ہے کیونکہ اسی سے توقع سننے اور سمجھنے کی ہوتی ہے"

یوسف۔ (ہنسکر) کم از کم آپ تو مجھے دانشمند نہ کہئے آپ خوب واقف ہیں کہ مجھ میں بیوقوف بن جانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے وہ تو کہئے بالکل حسن اتفاق تھا کہ خود فراموشی کی دنیا مجھے نصیب ہو گئی، ورنہ کسی پر دسترس حاصل کرنے کے لئے میں تو سر دیدینے کیلئے بھی تیار ہو جاتا"

تھوڑی دیر کے لئے سناٹا ہو گیا، حبیب خاموش تھا اور مس ہلن سر سے پانوں تک عرق عرق۔ مس ہلن کے لئے یوسف کا یہ فقرہ ایسا سخت طعن تھا اور اس کی آخری تحریر کا (جسے وہ دارجلنگ ہوٹل میں چھوڑ گئی تھی) اس قدر نشتریں جواب تھا کہ وہ اپنی جگہ تڑپ کر رہ گئی اور اپنی خفت کو مٹانے کے لئے سوائے اس کے کچھ نہ کہہ سکی کہ "اگر آپ خفا ہوتے ہیں تو میں ایسی گفتگو نہ کرونگی"

یوسف۔ میں! اور آپ سے خفا!! محسن سے خفا ہو جانا تو فطرت انسانی کے خلاف ہے، آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔ اگر میرے لب ولہجہ سے آپ نے ایسا خیال کیا تو میں کوشش کرونگا کہ حقیقت سے ہٹ کر آپ سے گفتگو کروں تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو

حبیب نے یہ دیکھکر کہ گفتگو نے غلط پہلو اختیار کر لیا ہے، قطع کلام کر کے کہا کہ "یوسف، سنو، مجھے یہ گفتگو مطلق پسند نہیں، خیال کی دنیا سے الگ ہو کر عملی دنیا میں آؤ اور پھر غور کرو کہ تمہاری موجودہ حالت کہاں تک قابل برداشت ہے

مجھے صاف صاف کہنا چاہئے کہ تمہاری یہ فضول خرچیاں، عیاشیاں، بیباکیاں اور خدا جانے کیا کیا کسی طرح مناسب نہیں مجھے حیرت ہے کہ یا تو تمہارا وہ عالم تھا کہ ایک معمولی کسان کے حدود معیشت و معاشرت سے آگے نہ بڑھتے تھے، یا اب یہ کیفیت ہے کہ سارے دارجلنگ میں تم سے زیادہ اوباش کوئی اور نظر نہیں آتا، برا نہ ماننا مجھے حق ہے کہ تمہارے لئے اس سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کروں۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا اور کب تک اس مکروہ زندگی کو اختیار کئے رہو گے؟"

یوسف نے نہایت نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ "آپ کو جو کچھ کہنا ہے ایک مرتبہ کہہ لیجئے تاکہ میں بھی ایک ہی بار اس کا جواب دیکر خاموش ہوجاؤں"

حبیب: "مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہنا کہ تم میرے ساتھ واپس چلو"

یوسف: "میں ابھی واپس نہیں جا سکتا۔ اور شاید کبھی نہیں، اس طرح ابھی نہ میں اس مکروہ زندگی کو ترک کر سکتا ہوں اور غالباً کبھی نہیں، معاف فرمائیے میری روح کی بغاوت ایسی معمولی نہیں کہ آپ یا کوئی اور اسپر غالب آسکے۔ چمن کی آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی طائر کو قفس کی پُرامن زندگی کی دعوت دینا، کوئی اچھی قسم کا فریب نہیں ہے۔ وہ شخص جس نے یہ فیصلہ کرلیا ہو کہ انسانی تگ و دو کی اصل غایت حصول نشاط ہے تو پھر وہ "اسباب نشاط" کی فراہمی کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ وہ چیز جسے میں "راحت روح یا نشاط زندگی" سے تعبیر کرتا ہوں، وہ حقیقتاً ایسی ہے بھی یا نہیں۔ سو اس کا معیار مقرر کرنا مشکل ہے یہ بالکل انفرادی چیز ہے۔ اور اس کو اجتماعی مسئلہ قرار دینا غلطی ہے۔ اگر میں آپ کی نزدیک اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوں تو ہونے دیجئے، لطف کی موت، بے لطفی کی زندگی سے اچھی ہے۔ کل مس گارڈن نے کلب میں پانچ ہزار مجھ سے جیتے اور اس سے قبل بھی ہمیشہ وہی جیتتی رہیں۔ یقیناً یہ رقم میری حیثیت سے کچھ زائد ہے لیکن میں خوش ہوں کیونکہ اس مادی نقصان کی تلافی جس روحانی نفرت کے ساتھ ہو جاتی ہے وہ کافی سے زائد ہے کیونکہ محبت و خلوص کی ادنیٰ قیمت جان ہے اور یقیناً میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ صحیح معنے میں اس کا تجربہ مجھے حاصل ہوا"

وہ یہ کہتا جا رہا تھا اور مس ہلن کے چہرہ پر ایک غیر معمولی مسرت کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ حبیب نے دیکھا اور تعجب سے دیکھا لیکن چونکہ وہ غریب خود معترف تھے کہ انھوں نے اس وقت تک مس ہلن کا کافی مطالعہ نہ کیا تھا، اس لئے یہ سمجھکر کہ ممکن ہے مس ہلن کی یہ مسرت کسی خاص جذبۂ ہمدردی کے بنا پر ہو خاموش رہگیا۔

اس واقعہ کے بعد دو دن تک مس ہلن اور حبیب کا قیام دارجلنگ میں رہا اور یوسف یہ دیکھکر بے انتہا مسرور ہوا کہ مس ہلن اور مس گارڈن کے تعلقات باوجود جدید ہونے کے بہت پُرخلوص تھے اور برخلاف حبیب کے مس ہلن نے ایک مرتبہ بھی مس گارڈن کے خلاف کوئی بات نہیں کہی، بلکہ جب ذکر آیا اس کی تعریف ہی کی۔ . . . .

ان لوگوں کو رخصت ہوئے ایک ہفتہ ہوچکا تھا اور یوسف اپنے مکان میں تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ مس گارڈن کا خادم ایک خط ہاتھ میں لئے ہوئے آیا اور بولا کہ میم صاحب کے نام یہ خط رجسٹری شدہ اس وقت کی ڈاک سے آیا ہے انھوں نے حکم دیا تھا کہ ڈاک فوراً ان کو پہونچا دیجائے اس لئے میں اس خط کو لایا تھا کہ انھیں دیدوں۔

یوسف: "مگر وہ تو یہاں نہیں آئیں۔ گھر سے نکلے ہوئے کتنی دیر ہوئی؟"

خادم۔ ایک گھنٹہ ہوا ہوگا، تو پھر میں یہ خط یہیں چھوڑے جاتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں اب وہ آتی ہی ہونگی، ڈاک خانہ جانے کو کہہ رہی تھیں، ممکن ہے وہاں دیر لگ گئی ہو۔ انھیں کلکتہ ایک بیمہ کرنا تھا"

یوسف "بیمہ! کس کے نام! کیا وہاں کوئی انکا عزیز رہتا ہے؟"

خادم "عزیز کا حال تو معلوم نہیں، لیکن اس سے قبل کئی مرتبہ میں خود ڈاک خانہ بیمہ کا لفافہ لیکر گیا ہوں، تھوڑی سی انگریزی جانتا ہوں اس لئے میں نے اسپر مس ہلن کا نام پڑھا تھا۔ ان سے ہماری میم صاحب کی بڑی دوستی ہے۔"

یوسف (انتہائی حیرت سے) مس ہلن! مس ہلن!!

خادم "جی ہاں، مس ہلن، آپ کو نہیں معلوم، ابھی تو وہ آئی تھیں، آپ کے ہاں کئی دن ٹھہری رہیں؟"

یوسف "ہاں، ہاں میں جانتا ہوں، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ تمہاری میم صاحب سے ان کی پرانی جان پہچان ہے"

خادم "بہت پرانی جان پہچان ہے، وہ ہمیشہ دارجلنگ آکر یہیں ٹھہرتی ہیں اور دونوں تک قیام کرتی ہیں، اب کی مرتبہ بھی کئی مرتبہ ان سے ملنے آئی تھیں" یوسف دیر تک خاموش رہا اور اس کا دماغ عجیب وغریب خیالات کا جولانگاہ بنا رہا۔ اول اول جب مس گارڈن کا اس نے تعارف کرایا تو وہ بالکل اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملیں اور کسی وا سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ باہم متعارف نہیں ہیں اس لئے یہ خیال کرکے کہ جو کچھ اسپر ظاہر کیا گیا، بالکل خلاف حقیقت تھا اس کو تکلیف ہوئی مگر پھر یہ سوچکر کہ خادم کھٹک جائے اس نے ضبط سے کام لیا اور یہ کہکر کہ "ہاں، مجھے ان کی دوستی کا حال معلوم ہے" اس گفتگو کو ختم کردیا۔ خادم نے کہا کہ "میم صاحب آتی ہونگی دیدیجئے گا" اور خط میز پر رکھکر چلا گیا۔

یہ مستطیل لفافہ تھا اور چاروں کونوں پر سرخ لاکھ کی مہریں لگی ہوئی تھیں سواد خط دیکھکر یوسف سمجھ گیا تھا کہ مس ہلن کا خط ہے، اور چونکہ اسی وقت بالکل نئی بات ان دونوں کے متعلق معلوم ہوئی تھی اس لئے یہ لفافہ ایک ایسا معمہ ہوگیا، جس کے حل کرنے کے لئے اس کی فطرت بے چین ہوگئی۔

وہ دیر تک خط کو ہاتھ میں لئے ہوئے دیکھتا رہا، غور کرتا رہا کہ اس میں کیا ہوگا۔ اس قدر احتیاط کے ساتھ بھیجنے کا کیا سبب ہوسکتا ہے الٹ پلٹ کر دیکھتا، مہروں کو چھوتا، ہاتھ پر رکھ کر اس کے وزن کا اندازہ کرتا اور کبھی کبھی بے اختیارانہ طور پر اس کو چاک کرنے کے لئے کونے پھاڑنے پر آمادہ ہوجاتا۔ لیکن اس خیال سے کہ خط کے آنے کا علم مس گارڈن کو ضرور ہوجائیگا اور چاک کیا ہوا خط دینا ناممکن ہوگا۔ پھر باز آجاتا، وہ نہایت کشمکش و پیچ میں تھا، اور اس کی خلش جستجو ہر دم بڑھتی جاتی تھی! ٹھیک اسی وقت کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی اور یوسف نے بے اختیاری کے ساتھ خط کو اپنی جیب میں چھپالیا۔ آتے ہی مس گارڈن نے پوچھا کہ "میرا کوئی خط تو نہیں آیا" اور یوسف نے بھی گھبراکر انکار کردیا۔ مس گارڈن یہ سنتے ہی خط لانے کی غرض سے الٹے پاؤں واپس گئی اور قبل اس کے کہ یوسف کچھ کہے یا اسے روکے وہ جاچکی تھی۔ مس گارڈن کے اس اضطراب نے اور زیادہ اسے متحیر کیا، یہاں تک کہ اس کا جذبۂ جستجو حد ضبط سے بڑھ گیا اور اس نے دروازہ بند کرکے خط کو چاک کرکے پڑھنا شروع کیا۔ خط طویل تھا اس لئے یوسف کو اس کے ختم کرنے میں دیر لگی۔ لیکن جس وقت وہ اس کو ختم کرچکا تو اس کا چہرہ غصہ سے سرخ تھا اور ایسا کرب اس کی ہر ادا سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

تھوڑی دیر تک تامل کرنے کے بعد، اس نے خادم کو آواز دی اور حکم دیا کہ فوراً اس کے سفر کا مختصر سا سامان درست کردے،

سب سے پہلی ڈاک سے اس کو روانہ ہو جانا ہے۔
جاتے وقت اُس نے ہدایت کی کہ مکان مقفل کر دیا جائے اور اگر مس گارڈن آئیں تو ان سے کہہ دے کہ وہ نہایت ضروری کام سے دو دن کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔

(۱۰)

جیب کے مسرت کی انتہا نہ تھی کیونکہ مس ہلن نے اُن سے عقد کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور کالج کے ہر حلقہ میں اسی خوش کام ازدواج کا ذکر تھا، جیب یقیناً متمول خاندان کا فرد تھا۔ لیکن یہ کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ وہ عروس کی رونمائی میں بیس ہزار کی رقم دینے کیلئے آمادہ ہو جائیگا۔

مس ہلن نے یہ رقم اپنے حسن و شباب کی قیمت میں نہیں لینا چاہی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اپنی اور جیب کے مواصلت کی یادگار میں ایک زنانہ صنعتی اسکول قائم کرے۔ یہ خیال اس قدر عجیب تھا کہ کالج کے ہر فرد کو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور ہر شخص ان دونوں کی وسعت نظر و سیر چشمی کی داد دے رہا تھا۔

نکاح کے منجملہ دیگر شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ جیب بیس ہزار روپیہ ایک زنانہ صنعتی اسکول قائم کرنے کے لئے مس ہلن کو دیگا اور رقم کی ادائی کے بعد ایک ہفتہ کے اندر دونوں کا عقد ہو جائے گا۔

شام کا وقت تھا مس ہلن کے علاوہ دو چار پروفیسر صاحب کے بنگلہ میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ حسب قرار داد جیب نے بکس سے بنک کی کتاب نکال کر چک پر بیس ہزار کی رقم درج کی اپنے دستخط ثبت کئے اور مس ہلن کی طرف بڑھایا، لیکن ابھی مس ہلن لینے کے لئے جھکی ہی تھیں کہ دفعتہً دروازہ نہایت زور سے کھلا اور یوسف انتہائی بدحواسی کے ساتھ دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور فوراً یوسف کے ہاتھ سے اس نے چک چھین کر اپنی مٹھی میں لے لیا۔

ہر شخص حیران تھا، کہ یہ کیا قصہ ہے، جیب باوجود غیر معمولی سنجیدہ انسان ہونے کے برہم تھا کہ یہ کیا حرکت اس نے کی، یوسف کا چہرہ بالکل دیوانوں کا سا تھا، سر کے بال پریشان تھے اور لباس بے ترتیب اضطراب اور بے چینی اس کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہو رہی تھی۔ مس ہلن نے اُس کو دیکھا اور کچھ سہم گئی۔ قبل اس کے کہ یہ منظر کوئی اور صورت اختیار کرے یا کوئی گفتگو شروع ہو، یوسف نے مس ہلن کے ہاتھ سے انکا چھوٹا بیگ ایک جھٹکے کے ساتھ چھین لیا اور اسے کھول کر ایک لفافہ نکالا جس میں کچھ کاغذات ملفوف تھے۔

مس ہلن اب چونکہ سارے معاملہ کو سمجھ چکی تھی اس لئے وہ گھبرا کر اٹھی تاکہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائے، لیکن یوسف نے بڑھ کر اُسکو روک دیا اور بولا کہ "مس ہلن ذرا صبر کیجئے اور اپنا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ تو ساتھ لیجائیے ورنہ پرسوں کی ڈاک کے جہاز میں آپکا جانا ممکن نہ ہوگا"۔

یہ کہکر اُس نے لفافہ کے اندر سے مس ہلن کا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ نکال کر سب کے سامنے میز پر ڈال دیا اور بولا کہ جیب تم مجھ سے ضرور خفا ہوگے کہ میں نے عین اسی وقت جبکہ جام تمہارے لبوں سے قریب تر ہو گیا تھا چھین کر پھینک دیا، لیکن

باور کرو کہ وہ جام شراب کا نہ تھا بلکہ نہایت قاتل زہر کا تھا" اور یہ کہکر اس نے اپنی جیب سے وہی خط نکالا جو مس ہلن نے مس گارڈن کے نام لکھا تھا اور حبیب کی طرف بڑھاکر کہا کہ" اسے بھی پڑھ لو تاکہ تم سمجھ سکو کہ ہندوستان کے مشہور سیاہ سانپ میں بھی وہ زہر نہیں ہوتا جو یوروپ کی سفید رنگ کی ناگنوں میں پایا جاتا ہے"

خط کا مضمون یہ تھا:-

"مائی ڈیر مس گارڈن"

میں اس لحاظ سے بیشک تمہاری بڑی معترف ہوں کہ تم نے اپنا کام نہایت کامیابی اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اصل معاملہ میں مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا مطالبہ ابھی اور باقی ہے۔ خود مسٹر یوسف سے مجھے معلوم ہوا کہ صرف ایک تاریخ میں پانچ ہزار روپیہ تم نے اُن سے حاصل کئے اور اس سے قبل بھی بارہا ہزاروں روپیہ تم نے جیتے کیا میں اس رقم میں برابر کی شریک نہیں ہوں۔ غور کرو کہ شروع سے لیکر اخیر تک، یوسف کے دماغ کی سائکالوجی کا مطالعہ کرکے تدریجی تدبیریں جو میں نے اختیار کیں کس طرح کامیاب ہوئیں یہانتک کہ میں انکو اس کومبئی کے سہراب جی والے معاملہ سے بھی زیادہ صحیح نشانہ خیال کرتی ہوں۔ اس وقت تک وقتاً فوقتاً مجھے صرف دو ہزار روپیہ ملے ہیں، لیکن تم خود سمجھ سکتی ہو کہ یہ کس قدر کم ہے

بہرحال مجھے یقین ہے کہ تمہاری نیت درست ہوگی اور کسی خاص وجہ سے تم نے اس طرف توجہ نہ کی ہوگی۔ میں نے مسٹر حبیب کے متعلق تمام واقعات سے اس مرتبہ دارجلنگ کے دوران قیام میں آگاہ کر دیا تھا۔ وقت آگیا ہے کہ اس معاملہ کو بھی ختم کردوں بیس ہزار کی رقم غالباً وہ کو مجھے بلجائیگی اور علی گڑھ سے یہ رقم وصول کرکے سیدھی بمبئی جاؤنگی۔ ۲۲ کی صبح کو امریکن ہوٹل میں ملو تاکہ باہم ملکر حساب کریں اور حبیب کے معاملہ کا جتنا روپیہ تم کو ملنا چاہئے وہ میں تمہیں دیدوں اور تم سے مجھے جو کچھ لینا ہے وہ لیلوں بالکل تیار ہو کر آنا۔ اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو تار دو تاکہ تمہارے ٹکٹ کا بھی انتظام کروں باقی تفصیلی باتیں ملنے پر ہونگی"

اس واقعہ کے بعد مس ہلن کا ہمیشہ کے لئے ساحل ہند کو خیرباد کہدینا اور مس گارڈن کا لاپتہ ہوجانا بالکل قدرتی نتیجہ تھا، لیکن سب سے زیادہ دلچسپ انقلاب وہ تھا جو یوسف کی زندگی میں پیدا ہوا۔ وہی خلد آباد ہے اور وہی اسکی ہری بھری کھیتیاں، جہاں صبح سے شام تک یوسف دھوپ میں کھڑے ہوکر کام کرتا ہے اور شام کو جب واپس آتا ہے تو گاؤں کے معصوم لڑکیوں کے گیتوں کو سن سنکر اس کی خستگی ایک خاص قسم کی روحانی لذت محسوس کرتی ہے

نیاز

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(مسلسل)

دوسری جانب میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ قدیم ایام کی خانہ جنگیاں ختم ہو گئی ہیں اور ان کے بجائے امن و امان قائم ہو گیا ہے اور زندگی زیادہ محفوظ ہو گئی ہے میں نے کسی ہندوستانی کو اس فائدہ کی اہمیت کو گھٹاتے نہیں دیکھا اسی طرح وہ ذہنی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی قدر و عافیت کا بھی معترف ہے، ذہنی نشو و نما کے لئے ایک حد تک سیاسی آزادی لازمی شے ہے۔ جہاں لوگ اظہار خیالات پر جرمانہ، قید یا موت کی سزا پاتے ہوں وہاں خیالات ترقی نہیں پا سکتے اور شخصی آزادی کی کمی نے ہندوستان کو صدیوں تک ذہنی غلامی میں مبتلا رکھا ہے۔ لیکن باوجود تمام نقائص کے انگریزی حکومت کے ماتحت خیالات آزاد رہے ہیں اور جن اشخاص نے غور و فکر کرنے کی جراءت کی ہے انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ایک ایسی نسل تیار ہو گئی ہے جو آزادی رائے کو بہت گراں مایہ شے شمار کرتی ہے اور اس کے باعث وہ دلیر ہو گئی ہے۔ شہروں کے رہنے والے ہندوستانی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، وہ کتابیں تصنیف کرتے ہیں، اخبارات نکالتے ہیں، ———— جلسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ عام تقریریں کرنے کی غرض سے دورے کرتے ہیں، بے خوف ہو کر سوچتے گفتگو کرتے اور بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور ان سب کا نتیجہ عام ذہنی و اخلاقی بیداری ہے۔ مزید برآں یہ معمولی بات نہیں ہے کہ بڑے درجوں کے آدمیوں میں جرائم کی تعداد کم ہو گئی ہے اور قدیم شاہانہ درباروں کی عیاشیاں جاتی رہی ہیں۔ جادو، زہر خورانی، قتل اور بدمعاشی کی زندگیوں میں کمی واقع ہو رہی ہے، ستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور صغر سنی کی شادی کے خلاف جوش و خروش جاری ہے۔ یہ نمایاں فوائد ہیں اور کوئی انگریز یا ہندوستانی ان کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اُن میں اُس امید کا عنصر مضمر ہے جو باقی تمام برائیوں کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔

لہٰذا ہندوستانی محبان وطن کی یہ نادانی ہوگی اگر وہ انگریزی تعلق کو منقطع کرنے کی کوشش کریں گے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ابھی اسے برا بھلا نہیں کہہ رہے ہیں صوبجات بنگال، مدراس اور بمبئی میں مشکل سے کوئی سمجھدار ہندوستانی ہوگا جو انگریزی تاج سے اپنے ملک کی فوری علیحدگی کا خیال دل میں لاتا ہو۔ بیرونی خطرات سے قطع نظر کر کے اندرونی ملک کے خطرات ایسے ہیں جنہیں سب تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں نہ وہ صرف مذہب کے پیرو ہیں اور نہ وہ ایک زبان ہی بولتے ہیں۔ اس کی سرحد میں ایسے حصص شامل ہیں جو بالکل وحشی ہیں۔ پہاڑی اقوام برچھیوں اور ڈھالوں سے ابھی تک مسلح ہیں اور امن پسند زراعتی آبادی نہایت جاہل ہے۔ تعلیم کا کام ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچا اور نہ حفاظت کی ضرورت کا خاتمہ ہوا ہے اسے سب تسلیم کرتے ہیں اور مسلح امپیریل حکومت کی ضرورت کو سمجھتے ہیں کہ اگر اسے ہٹا لیا جائے تو موجودہ مہذب سیاسی ڈھانچہ قائم نہیں رہ سکتا اور یہ بات مشتبہ ہے کہ آیا کوئی اور نظام اس کی جگہ لے سکتا ہے یا نہیں۔ میں دیکھنے سے قاصر ہوں کہ انقطاع تعلقات ہندوستان کے لئے مفید ہوگا اور سمجھنے سے عاری ہوں کہ انگریزی حکومت کے بجائے کسی اور غیر ملکی حکومت کا قیام انکی حالت کو بہتر بنا دیگا

ساتھ ہی میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ ناممکن ہے کہ موجودہ صورت حالات چند سال سے زیادہ قائم رہ سکے اینگلو انڈین حضرات کے نظام سے ہندوستانی کلیۃً متنفر ہیں مجھے یقین نہیں آتا کہ انگلستان پھر کسی فوجی بغاوت کو فرو کرنے کے قابل ہو سکیگا جسکے ساتھ لازمی طور سے تمام باشندوں کی ہمدردی شامل حال ہوگی۔ لیکن اگر اس بغاوت کے منحوس دن کا التوا بھی ہو جائے تو بھی فوجی طاقت کے ذریعہ جو حکومت کی جائے گی وہ بہت گراں ثابت ہوگی اور عرصہ تک اس کا چلانا ناممکن ہوگا۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے کہ ہندوستان پر انگریزی تلوار کے ذریعہ حکومت کیجاتی رہی ہے۔ لوگوں کی رضامندی حکومت کرنے میں ہمیشہ شامل رہی ہے اور اگر عام طور پر ترک موالات عمل میں آجائے تو موجودہ حکومت گھنٹہ بھر بھی قائم نہیں رہ سکتی فی الحال ہندوستانی انگریزی حکومت کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ان کے لئے مفید ہے اور اگر انہیں ایک مرتبہ یہ یقین ہو جائے گا کہ انگریز ان سے بہتر سلوک کرنا نہیں چاہتے اور انہیں زیادہ آزادی دینے کے خواہشمند نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ بغاوت کئے بغیر وہ حکومت کو ناممکن بنا دیں۔ یہ بات زیادہ زور سے بیان کرنے کے قابل ہے کہ ہمارا نظام حکومت ہندوستانی باشندوں کی مرضی اور موالات پر منحصر ہے۔

آخر عملاً وہ ریفارم کیا ہونی چاہئے اور وہ کون انتہائی منتہیٰ ہے جسے سیاسیات میں مصلحین کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے جب میں کلکتہ میں تھا تو اسوقت بہت سے جلسوں میں میں نے شرکت کی جہاں ہندوستان کے مختلف حصص کے ڈیلیگیٹ آئے تھے اس لئے میں کم و بیش صحت کے ساتھ ہندوستانی ضروریات

کے متعلق ہندوستانی خیالات کی ترجمانی کر سکتا ہوں۔ یہ بات بآسانی بیان کیجا سکتی ہے کہ اگرچہ ہمارے سب کے سب اپنی امیدوں کے پورا ہونے کا یقین رکھتے تھے لیکن کوئی شخص بھی ان میں ایسا نہ تھا جو یہ خیال کرتا ہو کہ ہندوستانی حکومت کے نظام میں ضروری تبدیلی پیدا کئے بغیر کامیابی ممکن ہے۔ ان کا استدلال حسب ذیل ہے: - اسوقت تک کوئی اصلاح عمل میں نہیں آسکتی جب تک کہ خود گورنمنٹ کی اصلاح نہ ہوجائے یہ انتہا درجہ کی قدامت پسند، خود غرض اور ہندوستانی جذبات وضروریات سے بالکل اجنبی ہے اور جس طرح سے کہ انگلستان کے مصلحین اس صدی کی ابتدا میں پہلے پارلیمنٹ میں اصلاح کرنے کے موید تھے اسی طرح سے ہندوستانی مصلحین بھی پہلے ملک کی حکمران جماعت کی اصلاح کے خواہشمند ہیں ———— اور ملک کی طاقتور رائے اس امر کی تائید میں ہے کہ ہندوستانی توقعات اور کسی طرح پوری نہیں کی جاسکتیں نہ ہندوستانی مشکلات اور کسی طرح حل نہیں کی جاسکتیں۔

موجودہ ہندوستانی نظام اس زمانہ سے ورثہ میں ملا ہے جبکہ حکام کے دل میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ اُن کا مطمح نظر ہندوستانیوں کو فائدہ پہنچانا ہے اس نظام کی بانی مبانی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جو ایک غیر ملکی تجارتی کمپنی تھی جو ملک کو اپنا مال قرار دیتی تھی اور جس کا یہ خیال تھا کہ فائدہ خالصۃً اس کے ممبروں کو پہنچے خواہ سود کی شکل میں یا شرکائے کمپنی کے رشتہ داروں اور دوستوں کو ملازمت دینے کی شکل میں۔ ہندوستانیوں کا صرف اتنا خیال رکھا جاتا تھا کہ ان کی خوشحالی کا اثر کمپنی پر پڑتا تھا اور ابتدا میں تو یہ خیال بھی نہ تھا۔ ہندوستان مالدار ملک تھا اور ہر سال یہاں سے دولت کی نہ کم ہونے والی کان سمجھا جاتا رہا۔ صرف وارن ہیسٹنگز کے مقدمہ کے بعد متعلقہ اشخاص کی حرص و آز کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ لندن کے ڈائرکٹران اور تینوں صوبوں میں ان کے ملازمین کا مقصد ایک تھا یعنی یہ کہ روپیہ کمانا اور جب کبھی ان کے درمیان اختلاف رائے ہوجاتا تھا تو وہ صرف نفع کی تقسیم کے متعلق ہوا کرتا تھا وہ سب کے سب مالدار بننا چاہتے تھے۔

بعد ازاں حکومت ڈائرکٹروں کے بورڈ کے سپرد ہوگئی جو ونڈیا ہاؤس میں بیٹھکر سول سروس کے ذریعہ انتظام چلاتا تھا اور چونکہ زیادہ تر ڈائرکٹران خود اس کے ممبر رہ چکے تھے اس لئے وہ اس ملازمت کی روایات کو برقرار رکھتے تھے۔ حکمران جماعت غایت درجہ کی متعصب، خود غرض اور ہر قسم کی نگرانی سے مبرا ہوگئی ایسی تھی جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی اسلئے کہ نہ تو وہ کسی شہنشاہ کی مرضی کے تابع تھی اور نہ رائے عامہ کے روبرو جوابدہ تھی۔ اس کی خود غرضی کو اگر کوئی قوت روکتی تھی تو وہ اس کے بعض ممبروں کی انفرادی نیکی تھی۔ صرف کمپنی کے نئے چارٹر عطا کئے جانے کے موقع پر انگریزی پارلیمنٹ اور پبلک اس امر کی متوقع تھی کہ کسی قسم کی دخل اندازی شاید ممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا دستور العمل بدستور چلتا رہا۔

مگر ۱۸۵۸ء میں کمپنی کا بحیثیت کمپنی کے خاتمہ ہوگیا۔ ڈائرکٹروں کے بورڈ کو موقوف کردیا گیا اور ہندوستانی سرمایہ پر سود دینا بند ہوگیا اور حکومت ہند براہ نام انگریزی تاج کو منتقل کردی گئی۔ اسوقت نظام حکومت کی اصلاح کے بارے میں بہت کچھ شور وغل کیا گیا اور اس امر کا باقاعدہ اعلان بھی ہوگیا کہ آئندہ سے ہندوستان پر ہندوستانیوں کی فائدہ رسانی کی خاطر حکومت کی جائیگی۔ برطانوی ہندوستان کے باشندگان کے نام جو شاہی اعلان شائع ہوا اس میں انگریزی رعایا کی حیثیت سے انکا مساوی درجہ تسلیم کیا گیا۔ سرکاری اعتماد کے فرائض کی ادائگی میں ان کے ساتھ کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اور امپریل پالیسی میں بھی یہ طے پاگیا تھا کہ انگریزی فوائد کو ہندوستانی فوائد پر ترجیح نہ دی جائیگی۔ یہ پروگرام نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اور ہندوستان میں اسکا جوش اور مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور انگریزی تاج کے لئے اسوقت جس حقیقی جذبات وفاداری کا اظہار کیا گیا تھا اس میں ابھی تک کمی واقع نہیں ہوئی اس میں صرف یہ نقص رہا ہے کہ اس پر آج تک عملدرآمد نہیں ہوا۔ تمام سرکاری اطلاعات، پالیسی کے بیانات اور شاہی اعلانات کے باوجود ہندوستانی حکومت کا اصول وہی ہے جو قدیم سے چلا آرہا ہے یعنی یہ کہ حکومت محض انگریزی تجارت اور انگریزی ملازمین کے فوائد کی حامی ونگراں ہے۔

اس عظیم ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ جب طاقت کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاج کے ہاتھ میں آگئی تو اسوقت پرانے نظام کو برقرار رکھنا بہت سہل معلوم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک سول سروس قائم کررکھی تھی جس میں اسی کے نامزد شدہ اشخاص داخل ہوا کرتے تھے جن کے فوائد رفتہ رفتہ کمپنی کے اغراض ومقاصد میں شامل ہوگئے۔ انھیں ایک خاص معاہدہ کے مطابق مقررہ مدت ملازمت اور بعد میں پنشن کے حقوق عطا کئے گئے۔ ان حقوق کو انگریزی حکومت نے بھی تسلیم کرلیا اور ان سے پھر اسی معاہدہ کی تجدید ہوگئی جو انھوں نے پہلے کمپنی سے کر رکھا تھا اور اسی طریقہ سے نظام حکومت میں مخصوص فوائد برقرار رہے جن کے باعث آزادنشوونما کی راہ میں ہمیشہ سے رکاوٹیں پیش آتی رہی ہیں۔

۱۸۵۸ء میں جو حقیقی تبدیلی عمل میں آئی وہ یہ تھی کہ نامزدگی کے بجائے تقرر امتحان پاس کرنے کے بعد کیا جاتا تھا لیکن سروس کی ترکیب جوں کی توں قائم ہے اور موجودہ زمانہ کا انگریز سولین کمپنی کے زمانہ کی طرح اب بھی ہندوستان کا عملی طور پر مالک ہے۔ اس کی موجودہ پوزیشن ایک جماعت کے فرد کی سی ہے یعنی یہ کہ نہ تو اسے برطرف کیا جاسکتا ہے اور نہ اس سے جواب طلب کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ اپنے ہم ملکیوں کے علاوہ اور کسی کے اختیار کے

آگے سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ تمام انتظامی اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہی تمام آمدنی کو خرچ کرتا ہے اور وہی تمام ادنیٰ ملازمتوں کا تقرر کرتا ہے۔ درحقیقت وہی خود گورنمنٹ ہے اور گورنمنٹ بھی نہایت مطلق العنان قسم کی +

لیکن یہ سول سروس کلیتہً قدامت پرست ہے۔ اگرچہ وہ ایک وسیع حد تک اعلیٰ اور دیانتدار اشخاص پر مشتمل ہے (اور یہ وہ اشخاص ہیں جو اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہیں اور صرف کبھی کبھی فرض منصبی سے زیادہ بھی کام کر لیتے ہیں) تاہم اس میں وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو اس قسم کی جماعتوں میں ہونی لازمی ہیں۔ وہ پہلے اپنے فائدہ پر نظر رکھتی ہے اور پھر ہندوستانیوں کے مفاد کا خیال کرتی ہے اس امر کا بیان کرنے سے اس کے ممبروں پر کسی قسم کی برائی عائد نہیں ہوتی۔ ابھی تک دنیا میں کوئی ایسی جماعت پیدا نہیں ہوئی جو اپنی جیب کو نقصان پہنچا کر عامۃ الناس کی بھلائی کرنے کی خواہشمند ہو اور انڈین سول سروس جو اس قاعدہ کی مستثنیات میں سے نہیں ہے، یہ دیکھ رہی ہے کہ ریفارم ہوتے ہی اس کی تنخواہ میں کفایت شعاری پیدا ہو جائیگی، اس کے حقوق کم کر دئے جائیں گے اور ملازمت کا میدان محدود ہو جائیگا۔ اس قسم کی ملازمت فطرتاً ہر کفایت شعاری اور ہر تبدیلی کی دشمن ہوا کرتی ہے +

لہذا جب میں ہندوستانی مصلحین کے ساتھ ہمنوا ہو کر یہ کہتا ہوں کہ اس سول سروس کی اصلاح کیجائے، تو سب سے پہلے میری اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ رکاوٹ کو ہٹا دیا جائے لیکن سول سروس، پارینہ ہو چکی ہے اور اب ضرورت نہیں ہے کہ اس فضول خرچی کو قائم رکھا جائے ممکن ہے کہ بیس، چالیس یا پچاس برس بیشتر تک اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو کہ تعلیم یافتہ انگریزوں کی خدمات نہایت شاندار تنخواہیں دیکر عمر بھر کے لئے اس زمانہ کے ہندوستان جیسے دور دراز ملک کے لئے حاصل کیجائیں۔ ایک نسل پہلے یہ لوگ گویا سب تھے اور اس لئے ممکن ہے کہ انڈیا ہاؤس (جو اب انڈیا آفس کہلاتا ہے) اپنی ضرورتوں کے باعث خاص خاص حقوق دینے اور اعلیٰ درجہ کی تنخواہیں دینے پر مجبور ہو لیکن موجودہ زمانہ نے سب کچھ تبدیل کر دیا ہے اور قابلیت کی بہم رسانی اس قدر زیادہ ہے کہ کسی قسم کا خاص معاہدہ کئے بغیر اچھی سے اچھی شئے میسر آ سکتی ہے۔ تجارتی کمپنیوں نے اس پرانے خیال کو اب ترک کر دیا ہے اور اب وہ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان کے لئے بھی کھلی منڈی میں اپنے آدمی تلاش کرتی ہیں اور انھیں محض اس وجہ سے گھٹیا مال دستیاب نہیں ہوتا کہ وہ عمر بھر کے لئے نہیں رکھتیں اور اگر گورنمنٹ آف انڈیا مالی لحاظ سے اپنا سر پانی کی سطح سے بلند رکھنا چاہتی ہے تو اسے بھی آئندہ زمانہ میں اسی اصول پر عملدرآمد کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ مساوی قابلیت کے انگریز ½ تنخواہ پر میسر آ سکیں گے اور ان کیلئے کسی خاص معاہدہ کی ضرورت پیش نہ آئیگی۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اعلیٰ ترین مدارج کے سوائے باقی تمام انگریزی سروس کا خاتمہ کر دینا بدرجہا بہتر ہوگا اور ان کے بجائے کم شرح کے ہندوستانی اشخاص ملازم رکھے جائیں، جن کے لئے یہ کم شرح بھی کافی ہوگی۔ بہت زیادہ تعداد میں انگریزوں کو ملازم رکھنے کا رجحان حال ہی میں پیدا ہوا ہے اور اس میں ہر طرح کا نقصان ہی نقصان ہے +

لہذا سول سروس کے بجائے ایک مخصوص سول سروس رونما ہوگی گو جسکے ساتھ خاص حقوق شامل ہوں گے۔ اس کے افراد زیر نگرانی ہونگے اور حقیقی معنوں میں ملک کے خدمتگار اور ملازم متصور ہوں گے۔ موجودہ زمانہ میں وہ اس کے آقا بنے ہوئے ہیں +

یہ امر کہ وہ اس کے آقا ہیں، کافی طور پر ان کوششوں کی کامیابی سے ثابت ہو گیا ہے جو گذشتہ تین سال میں لارڈ رپن کی پالیسی کو ناکام بنانے میں عمل میں آ چکی ہیں۔ لارڈ رپن ہندوستان میں ایسے زمانہ میں آئے تھے جبکہ مڈلوتھین کی فتح[1] حالت شباب میں تھی اور وہ ان خیالات کو عمل میں لانے کے نہایت سرگرم مؤید تھے جن کا اظہار انھوں نے اپنی تقریروں میں کیا تھا۔ ان کے خیالات میں اگرچہ اب تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی لیکن ان کے وائسرائے بننے سے خاک فائدہ نہیں پہنچا۔ جو مسودۂ قانون بھی انھوں نے پیش کیا وہ تفصیلات میں پڑکر ناکام رہا۔ اور سول سروس اس قدر طاقتور ثابت ہوئی ہے کہ اس نے ہندوستان کے بارے میں آزاد پالیسی کو ترک کر دینے کے لئے انگلستان کی حکومت کو بتدریج مجبور کر دیا۔ جب میں ہندوستان پہونچا تو میں نے لارڈ رپن کو اسکول کے اس طالب علم کی طرح پایا جو اپنے ہمجولیوں کے ساتھ دوڑ میں سب سے آگے بھاگا جا رہا ہے اور اُسے اتنی خبر نہیں کہ اس کے باقی ساتھی رک گئے ہیں۔ اور یہ کہ باقی ساری دنیا اسکی غیر ضروری سرگرمی پر خندہ زن ہو رہی ہے۔ مڈلوتھین کے باوجود اینگلو انڈین بیوروکریسی اپنے تئیں انکا آقا ثابت کر چکی تھی +

لیکن اگر سول سروس مردہ کمپنی کا رکاوٹ پیدا کرنے والا اور تکلیف دہ ورثہ ہے تو لندن میں ہندوستانی گورنمنٹ کے نظام کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے ۱۸۵۸ء میں جب کمپنی کا خاتمہ ہوا تو انڈیا ہاؤس کے بجائے انڈیا آفس قائم کیا گیا اور بورڈ آف ڈائرکٹرز کے بجائے انڈین کونسل کا وجود ظہور میں آیا

[1] اس سے مراد وہ فتح ہے جو گلیڈاسٹون کو اسوقت حاصل ہوئی جبکہ انھوں نے مڈلوتھین کے مقام میں اپنی آزاد پالیسی کا اعلان کرکے میجارٹی کو اپنا ہمخیال بنا لیا +

اس تبدیلی سے دکھانا بہت کچھ مقصود تھا مگر عملاً کچھ بھی نہیں ہوا۔ انڈیا آفس مجبور ہے کہ پرانی روایات کی نمائندگی کرے اور کونسل جو اسکی کارروائیوں کو روکنے کے لئے بنائی گئی تھی، بورڈ آف ڈائرکٹرز سے کہیں زیادہ قدامت پسند اور رکاوٹ واقع ہوئی ہے اس کا سبب بالکل بدیہی ہے۔ کونسل جو کم و بیش پنشن یافتہ سول اور ملیٹری ملازمین پر مشتمل ہوتی ہے صرف اینگلو انڈین سروس کے نقطۂ خیال سے ہندوستانی معاملات پر بحث کرتی ہے۔ وہ جدید خیالات کو قبول کرنے کی جانب مقابلتہً کم مائل ہے اور ہندوستانیوں کے جدید خیالات سے بالکل نابلد ہے۔ وہ تجربہ کے اعتبار سے ایک نسل پیچھے ہی رہتی ہے۔ اسی طرح سے وزیر ہند جو کلیتہً اس اندھے رہنما پر اپنا انحصار رکھتا ہے، انگلستان میں بعینہٖ وہی حیثیت رکھتا ہے جو وائسرائے کی ہندوستان میں ہے۔ بالعموم وہ ہندوستانی معاملات سے بے خبر رہتا ہے اور انڈیا آفس اور اپنی اینگلو انڈین کونسل سے مشورہ طلب کرتا ہے اور اس لئے وہ کبھی سچائی معلوم نہیں کر سکتا یہی سبب ہے کہ انکی رہنمائی میں وہ اندھے پن میں غلطیاں کرجاتا ہے خواہ وہ کتنا طاقتور اور سنجیدہ ہو اس کے لئے ناممکن ہے کہ مصلح کی حیثیت سے ان کے مقابلہ میں قائم رہ سکے +

لہذا جو اصلاحات ہندوستانی باشندے انگلستان اور ہندوستان میں نہایت زور اور اصرار کے ساتھ طلب کر رہے ہیں وہ ہندوستان سے متعلق تو اتنی ہیں کہ سول سروس کے نظام کو بالکل بدل دیا جائے اور عمر بھر کے پٹے اور معاہدے منسوخ کرکے ہندوستانیوں کو آزادانہ طریقہ سے آئین بغیر کسی معاہدہ کے داخل کیا جائے۔ وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جوں جوں جگہ خالی ہوتی جائیں دوں دوں ہندوستانیوں کے لئے مناسب تعداد محفوظ رکھدی جائے اور اس طرح سے بتدریج سوائے اعلیٰ ترین عہدوں کے باقی سب کے سب ہندوستانی باشندوں سے پر کئے جائیں مزید برآں لندن کی کونسل میں وزیر ہند کو مشورہ دینے کے لئے ہندوستانی اور اینگلو انڈین پنشن یافتہ افسر ہونے چاہئیں انکا خیال ہے کہ جب تک ایسا نہ کیا جائیگا اسوقت تک گورنمنٹ آف انڈیا تاریکی میں رہیگی اور اصلاحات کی سب کوششیں رائیگاں ہو جائیگی +

یہ ظاہر ہے کہ ایسے ابتدائی تغیرات زیادہ ضروری اصلاحات کی جانب صرف پہلا قدم ہیں۔ ہندوستانی جس شے کا مطالبہ کرتے ہیں وہ سوراج ہے یعنی یہ کہ نہ صرف انتظامی طاقت ان کے ہاتھ میں دیدی جائے بلکہ یہ کہ قوانین وضع کرنے اور مال کے اختیارات انھیں سونپ دئے جائیں۔ فی الحال ہر صوبہ میں قانون وضع کرنے کا اختیار گورنر باجلاس کونسل کے ہاتھ میں ہے اور پبلک کے نمایندوں کو اس میں شریک کرنے کا کوئی انتظام نہیں کونسلیں کلیتہً نامزد شدہ ممبروں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کا کام محض مشورہ دینا ہے۔ کیونکہ وہ کسی چیز کو پیش کرنے یا اسے نامنظور کر دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ ہر کونسل میں چند ہندوستانیوں کو جگہ دیدی گئی ہے مگر وہ کسی اعتبار سے ملک کے نمایندے نہیں کہلائے جا سکتے بلکہ گورنمنٹ کے نامزد شدہ ممبر ہیں اور محض اس لئے منتخب کئے گئے ہیں کہ ان میں گورنر کی ہاں میں ہاں ملانے کی قابلیت موجود ہے۔ باقی تمام ممبر انگریز (سول اور ملیٹری افسر) ہوتے ہیں جو ممبری کو اپنی خدمات کا انعام تصور کرتے ہیں اور جو محض سرکاری خیالات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ لارڈ رپن نے بلاشبہ اپنی صوبجاتی کونسل میں آزاد خیال ہندوستانیوں کو داخل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جو لوگ بالعموم اس عہدے پر مقرر ہوتے ہیں اُن کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی سہ سالہ میعاد کے بعد دوبارہ ممبر مقرر کئے جائیں اس لئے ہندوستانیوں کے جذبات کی نمایندگی کرنے کے بجائے وہ گورنر کی ہمنوائی کرتے ہیں۔

ع "آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم"

یہ خوشگوار صورتِ حالات نہیں ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پبلک کی مختلف جماعتوں کو اپنے نمایندے منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے اور ان کی توسیع میعاد کا اختیار گورنر کے ہاتھ میں نہو اور جب کونسلروں کی تعداد بڑھ جائیگی اور بحث و مباحثہ کرنے اور سوالات پوچھنے کا میدان وسیع کر دیا جائے گا تو اسوقت اس مطمح نظر کی اچھی خاصی بنیاد پڑ جائیگی جسے ہندوستانی صوبہ وار پارلیمنٹ، کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کم سے کم ابتدائی قسم کی لوکل پارلیمنٹ کی اہلیت نہیں رکھتا۔ بلاشبہ کچھ عرصہ کے لئے کونسلوں میں انگریزی عنصر کی زیادہ مقدار رکھنے کی ضرورت ہوگی لیکن ہندوستانی دماغ بہت جلد باتیں اخذ کرلیتا ہے اور دوسری نسل میں بغیر کسی خطرہ کے قوانین سازی کا سارا کام انہی کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور مالیات کی کلی نگرانی بھی انہی کے ہاتھ میں دیجا سکتی ہے +

اس سے یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ میں ہندوستان کے لئے امپیریل پارلیمنٹ کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ ہندوستان اسقدر وسیع ملک ہے اور اس میں اس کثرت سے مختلف اقوام آباد ہیں کہ بظاہر یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ہی جماعت میں ان سب کے نمایندے شریک ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ کبھی دور دراز

آئندہ زمانہ میں جاکر اس قسم کی پارلیمنٹ وجود میں آجائے مگر ہم لوگوں کی زندگی میں تو یہ شکل نظر آتی ہے۔ امپریل طاقت (بشرطیکہ اسے موثر بنانا منظور ہو) ایک ہی شخص کے ہاتھ میں رہنی چاہیئے اور وائسرائے کے اختیارات کو کمزور کرنے کے بجائے میری خواہش ہے کہ نہیں اور زیادہ طاقتور بنا دیا جائے۔ لیکن صوبوں میں اور تمام صوبہ داری معاملات کے لئے سیلف گورنمنٹ ایک ضروری شے ہے اور موجودہ زمانہ اسے عملی شکل میں دیکھنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے +

ہندوستان کی سب سے اہم اور فوری ضرورت کفایت شعاری ہے اور اس کے لئے مالیات کی لامرکزیت بہترین علاج ہے ہر صوبہ کا اپنا بجٹ علیحدہ ہونا چاہیئے اور اپنی سول لسٹ بھی جسپر سالانہ کونسل کی رائے لی جانا چاہیئے۔ اسکی سول سروس اپنی علیحدہ ہونی چاہیئے اور تعمیرات عامہ کا محکمہ بھی اسی کا ہونا چاہیئے جسمیں کلکتہ کی جانب سے کسی قسم کی دخل اندازی نہ ہونی چاہیئے۔ پراونشل اور امپیریل حسابات بھی علیحدہ علیحدہ رکھنے چاہئیں۔ موجودہ صورت میں جبکہ مختلف قسم کی امپریل ملازمتیں رواج پاگئی ہیں اور جنکا صدر مقام کلکتہ یا شملہ ہے، روپیہ کا ضائع ہونا مناسب طریقہ سے نہیں رک سکتا۔ حسابات خلط ملط رہتے ہیں اور وہ لوگ جنپر ٹیکس کا بار پڑتا ہے کسی قسم کی نگرانی نہیں رکھ سکتے اور کوئی شخص ٹھیک طور سے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ عام بجٹ میں جو اخراجات دکھائے جاتے ہیں وہ کہاں کہاں خرچ کئے جائیں گے۔ لیکن اگر حسابات صوبہ داری ہوں اور مقامی اسمبلی کی جانچ پڑتال کے لئے کھلے ہوں تو موجودہ خرابیوں میں سے ایک بھی باقی نہیں رہیگی۔ کلکتہ کے محکموں کے افسران خواہ نیت کے کتنے ہی اچھے ہوں، وہ مدراس یا پنجاب کے اخراجات کی تفصیل سے واقف نہیں ہو سکتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بے انتہا روپیہ ہر جگہ ضائع ہو رہا ہے اور غبن بھی کیا جا رہا ہے +

میری خواہش یہ ہے کہ جہاں تک سول معاملات کا تعلق ہے ہر صوبہ کا اپنا علیحدہ انتظام ہو، ذرائع آمدنی بھی اپنے طور پر پڑ جائے، امن عامہ کی ضروریات کو پورا کرے اور صوبہ داری کونسل کا انتظام و نگرانی کرے۔ بعض صوبوں میں خالصتہ ہندوستانیوں کو ملازم رکھنے سے ابتداہی سے کفایت ہو جائیگی، دوسرے صوبوں میں انگریزی ملازمین کے بجائے ہندوستانیوں کا تقرر بلاشبہ بتدریج عمل میں آئیگا ان صوبوں میں غیر ضروری اخراجات کو کم کرنے کی تحریک یہ دیکھکر خود پیدا ہوگی کہ اخراجات کا بار براہ راست صوبہ پر پڑ رہا ہے۔

برخلاف اس کے یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان جب تک انگلستان کی زیر نگرانی ہے، مال اور انتظام اور وضع قوانین کے بعض فرائض امپریل رہینگے جو حسب ذیل ہوں گے:-

(۱) فوج اور بیڑے کے متعلقہ اخراجات اور ذمہ داریاں (۲) سیاسی تعلقات۔ (۳) عام قرضہ اور (۴) محاصل بحری۔

فوج کے متعلق جو اخراجات کئے جائیں وہ بلاشبہ امپریل ہی رہنے چاہئیں اس لئے کہ اگرچہ جنوبی ہندوستان کو اپنی سرحدات کے اندر امن قائم کرنے کی غرض سے افواج کی بہت کم ضرورت ہے، تاہم شمالی ہندوستان کی طرح وہ ہر بیرونی حملہ سے محفوظ ہے اور اُس کی ذمہ دار صرف فوج ہی ہو سکتی ہے، لہذا اس کے اخراجات کا بار اس پر بھی مساوی پڑنا چاہیئے صوبہ داری افواج کا نظام کفایت شعاری کے لحاظ سے سخت غلطی ہوگی اور اُن صوبجات پر بڑا ظلم ہوگا جو سرحد پر واقع ہیں۔ کفایت شعاری کی غلطی تو یہ ہے کہ جو اقوام کم جنگجو ہیں وہ مساوی تنخواہ حاصل کرکے ادنی درجہ کے سپاہی مہیا کریں گی جو سلطنت کی عام طاقت کے لئے مضرت رساں ہوگا۔ بے انصافی یوں کہ شمال مغربی صوبجات ہی پر حفاظت کا تمام بوجھ آکر پڑ جائے گا۔ لہذا جس طرح سے میں تمام سول معاملات میں نہایت زور شور سے لامرکزیت کے اصول کی حمایت کر رہا ہوں اسی شد و مد سے میں فوجی معاملات میں مرکزیت کا موید ہوں امپریل فوج میرے خیالات کے مطابق وائسرائے کے ماتحت ہونی چاہیئے اس کے افسر انگریز ہوں اور سپاہی بہترین قسم ہوں جو ہندوستان میں دستیاب ہو سکتے ہوں اور فوج بھرتی کرتے وقت کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔ ظاہر ہے کہ فوج کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ نہایت ہشیار اور اپنے فن میں ماہر ہو اور یہ کہ اس میں سیاسی تعصبات کو دخل نہ ہو اور ان دونوں وجوہ سے میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی افسروں کے مقابلہ میں انگریز فوجی اعتبار سے ہندوستان کے بہتر ملازم بن سکینگے۔ اگرچہ سول معاملات میں ہندوستانیوں کی قابلیت کا بہت مداح ہوں تاہم میں اسی واقعہ کو تسلیم کرتا ہوں کہ انگریز فوج کے بہترین کمانڈر بن سکتے ہیں اور یہ کہ وہ اسی نسبت سے اچھا

اعلیٰ تنخواہ کے مستحق ہیں اور چونکہ دیسی افسروں کے برعکس مذہبی یا ذات پات کے اثرات سے بالکل بری ہوں گے اس لئے وہ امپریل احکام کو غیر جانبدارانہ طریقہ سے عمل میں لا سکیں گے ہندوستانی فوج کو میں اسی معنی میں امپریل اور انگریزی دیکھنا چاہتا ہوں جس معنی میں میں سول ملازمتوں کو پراونشل اور ہندوستانی دیکھنے کا خواہشمند ہوں - یہاں پر میں صرف اپنی ذاتی رائے کو بیان کر رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی رائے دیسی فوجی ملازمت کی تائید میں ہے، لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا جب ہندوستان ایک قوم ہو جائیگا تو اس وقت قومی فوج کے قیام کے متعلق غور وخوض کرنے کا بہت وقت ملیگا +

مزید برآں سیاسی تعلقات ہر لحاظ سے امپریل ہی رہنی چاہئیں اور ان کا انتظام خاص وائسرائے کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جس طریقہ سے آج کل ہندوستانی ڈپلومیسی کا انتظام کیا جاتا ہے وہ پیچیدہ اور گراں ہے لیکن مستقبل کے ہندوستان میں ہمیں اُمید ہے کہ اسے آسان بنانے کی کوشش کیجائیگی - دو اہم امور غور کرنے کے قابل ہیں:- ایک تو یہ کہ غیر ملکی سازشوں اور لڑائیوں سے کلیتہً علحدگی برتی جائے اور دوسرے یہ کہ خود مختار ہندوستانی والیان ریاست پر پورا پورا اعتماد کیا جائے - غیر ملکی لڑائیوں کا ہندوستان کو کافی تجربہ ہو چکا ہے اور مزید تجربہ کی اُسے ضرورت نہیں - چین، ایران، افغانستان، ابی سینا، مصر اور اب سوڈان، ان سب ملکوں کی لڑائیوں میں ہندوستان اپنے مفاد اور اپنی رضامندی کے خلاف شریک ہونے پر مجبور کیا گیا ہے - روپیہ کے نقصان کے علاوہ ان لڑائیوں میں قومی وقار کو بھی صدمہ پہنچا ہے جسے ہندوستانی غصہ کی نظر سے دیکھ رہے ہیں - جو لوگ یورپ کے شریفانہ علم ادب سے واقف ہیں وہ اس امر کو باعثِ ہتک خیال کرتے ہیں کہ خود مفتوح ہو کر وہ دوسری اقوام کو مغلوب کرنے کا ذریعہ بنیں ہندوستان کا بدقسمت مصریوں سے کیا جھگڑا تھا؟ اس کا بدقسمت عربوں سے کیا تنازعہ تھا؟ تعلیم یافتہ ہندوستانی اسے بھی ناراضگی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس سے خرچۂ جنگ وصول کیا جائے یہ امور کسی مزید تشریح کے محتاج نہیں - یہ اس مطلق العنانہ خود غرضی کا جزو ہیں جو ہندوستان کے ساتھ ہمارے گزشتہ تعلقات کی بنیاد رہی ہے اور ہندوستان کے جدید جسم میں یہ سب باتیں تبدیل کر دینی چاہئیں - ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ جو تعلقات رہے ہیں ان میں ہوکہ اور زیادتی کو بڑا دخل رہا ہے مستقبل کی پالیسی میں زیادتی کا خیال مطلق چھوڑ دینا چاہئے - ہندوستانی ریاستوں کی جانب صرف ایک پالیسی ہی سچی کہلائی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کے روبرو برطانوی ہندوستان کو ان کے باشندوں سے زیادہ خوشحال بنا کر پیش کیا جائے - کیا کوئی شخص شبہ کر سکتا ہے کہ اگر ہندوستان میں سلف گورنمنٹ قائم ہو، وہ زیادہ خوشحال اور قانع نظر آئے، تو قدیم دیسی ریاستیں ایک ایک کر کے اسمیں جذب نہ ہو جائینگی؟

قرضہ کے متعلق یہ ہے کہ اگرچہ ہمیں افسوس ہے کہ اسے کیوں لیا گیا، تاہم اس کا بار امپریل گورنمنٹ پر ہی پڑنا چاہئے - جنگ کے خرچہ کی طرح اس کے سالانہ سود کو صوبوں پر ان کی مالی حالت کے اعتبار سے تقسیم کر دینا چاہئے سوائے اس حصہ کے جس کا تعلق ریلوں کی ضمانت سے ہے جس کا بار بھی متعلقہ صوبجات کو اُٹھانا چاہئے - بہر حال آئندہ کے لئے، یہ پالیسی اختیار کر لینی چاہئے کہ مزید قرضہ نہیں لیا جائیگا اور امپریل کاموں کے لئے مزید ضمانتیں نہیں دی جائینگی - آئندہ سے رسل ورسایل، آبپاشی اور تزئین وترقی کے کل کاموں کا بوجھ صوبوں پر پڑنا چاہئے جن کے فوائد کی وہ بہت زیادہ قدر کریں گے +

باقی رہا محاصل بحری کا سوال تو اسے بھی امپریل ہی رکھنا بہتر ہے اور یہ توقع رکھنی چاہئے کہ جب ہندوستان کی حکومت کے سلسلہ میں ہندوستان کے فائدہ (انگلستان کے فائدہ کا نہیں) کا خیال کیا جائیگا تو اس وقت امپریل اخراجات کو پورا کرنے کی غرض سے اسے فائدہ بخش مد بنا دیا جائیگا - ہندوستان کے لئے آزاد تجارت باعث برکت ثابت نہیں ہوئی اور سال درآمد پر محاصل لگانے کا اصول اعلیٰ مالیات کا اصول اولین ہے جسکے لئے خود اختیاری حکومت رکھنے والا ہندوستان سخت اصرار کریگا - ہماری اکثر نوآبادیاں لینا فائدہ اسی میں دیکھتی ہیں - اور ہندوستان بھی ایسا ہی کریگا تاوقتیکہ معقول معاوضہ نہ دیا جائے - موجودہ صورت حالات یہ ہے کہ سارا فائدہ انگلستان کا ہے اور ہندوستان کو سراسر نقصان پہنچ رہا ہے +

ہندوستان کو سوراج دینے کے متعلق یہ میری مختصر اور ناقص اسکیم ہے - یہ ناممکن الحصول نہیں ہے اور جن لوگوں نے انگلستان کے ایک قریبی

رفتہ رفتہ خامشی چاروں طرف چھانے لگی
نیند کی سی آنکھوں میں اک کیفیت آنے لگی

میں اسیر رنگ و بوئے حسن فطرت ہوگیا دل نثار لذت انعام نکہت ہوگیا
دیدۂ پر شوق وقف شان قدرت ہوگیا اور شہباز تخیل محو وسعت ہوگیا
کھل گئیں آنکھیں تماشائے دو عالم کیلئے
گر پڑے آنسو مرے تقلید شبنم کیلئے

بحر نیلی میں رواں تھیں کشتیاں یوں نور کی آب جو میں بجلیاں ہو جیسی کوہ طور کی
کیوں نہ ملتی پھر خبر ساحل کے قرب و دور کی کرتی جاتی تھیں وہ شرحیں منصب مامور کی
کہکشاں کے جام میں اک جوشش جوئے شیر تھا
اور مریخ فلک ظرف تمنا گیر تھا

داغ مہ یوں تھا عیاں اک زورق پر نور میں جیسے پیوستہ ہو پتلی دیدۂ مخمور میں
یوں شعاعیں بھر گئی تھیں کاسۂ معمور میں "بادۂ سرجوش" جیسے ساغر بلور میں
جاذب ادراک تھیں نیرنگیاں اس رات کی
باعث حیرانیاں تھیں مستیاں اس رات کی

آسمانی بزم میں ضوگستری کا جوش تھا ایک اک ذرہ جہاں کا ساکت و خاموش تھا
میں سرور بادۂ حیرت سے گو مدہوش تھا شوق کی آنکھیں کھلی تھیں مستعد ہر گوش تھا
اللہ اللہ اے امید و بیم کیف انتظار!
چل رہی تھی دل جگر دونوں پہ سیف انتظار!!

رفتہ رفتہ زلف شب زیر کمر ہونے لگی شمع محفل خوگر جور سحر ہونے لگی
خوش خرامی صبا بیدادگر ہونے لگی بانگ مرغ بوستاں بانگ نفیر ہونے لگی
تھا یہی عالم نئی اک پھانس دل میں گڑ گئی
ایک رشک گل سے چشم شوق جاکر لڑ گئی

تھی وہ گلرو یاسمن بو لالہ رخ مست شباب تھا سراپا اس کا جوش حسن فطرت کا جواب
چشم کی گردش میں لطف گردش جام شراب پتلیوں میں بجلیاں تھیں بجلیوں میں تھا حجاب
انکھڑیوں کی ہر ادا تھی اس طرح مچلی ہوئی
جس طرح رندوں کی نیت ابر میں بدلی ہوئی

عارضِ گلرنگ سے "حسنِ تنوع" تھا عیاں — یا شبابِ شوق میں گلریز تھا کیفِ نہاں
پتلے پتلے ہونٹوں میں برقِ تبسم تھی رواں — دعوئ صبر و سکوں کا کر رہی تھی امتحاں

لرزشِ لب میں تکلم کی فضا پوشیدہ تھی
سامعہ کے واسطے برقِ غضب لرزیدہ تھی

جلوہ گاہِ حسن میں جو ذرہ تھا مسجود تھا — سبز فرشِ خاک پر پائے حنا آلود تھا
رازِ مخفی "پیکرِ مخمور" میں موجود تھا — ذرہ ذرہ فطرتِ معصوم کا مشہود تھا

زلف کی شبگونیت تھی سر بسر ہمت ربا
حسن کی موزونیت تھی طاقت قسمت ربا

مست آنکھیں دیکھ کر سوجی سے دیوانہ ہوا — انتہائے شوق میں اپنے سے بیگانہ ہوا
از سرِ نو دل کا پھر آباد ویرانہ ہوا — کعبۂ احساس میرا مثلِ بت خانہ ہوا

کھنچ گیا میں اس طرح اس حسنِ زیبا کی طرف
جامِ ساغر جس طرح جھکتے ہیں مینا کی طرف

کاوشیں قلب و جگر کی پھر سرور افزا ہوئیں — آرزوئیں کوہِ طورِ دل کی موسیٰ ہوئیں
دیکھ کر مجھکو وہ آنکھیں مائلِ ایما ہوئیں — شرم آلودہ نظر سے بجلیاں پیدا ہوئیں

دل مرا بیتاب اظہارِ محبت ہو گیا
یعنی ایمانِ تمنا نذرِ الفت ہو گیا

کچھ سمجھ کر پہلے تو خاموش تھی مستِ شباب — چینِ پیشانی تھی لیکن ترجمانِ اضطراب
"زلفِ برہم" بنگئی تھی مرکزِ صد پیچ و تاب — یا زبانِ حال سے دیتی تھی مجھکو یہ جواب

عشق کے کعبے میں عاشق کو یہی پیغام ہے
"جامۂ صبر و رضا بس جامۂ احرام ہے"

گو شرابِ تند جوش بادۂ گلفام ہے — جو نہ چھلکے مست ہو کر بس وہی اک جام ہے
راہِ الفت میں تمنا اک خیالِ خام ہے — عشق خود آغاز ہے خود عشق ہی انجام ہے

جوش و سرمستی بھی ہو تو دائرے میں ضبط کے
شکوہ ریزی بھی جو ہو تو قاعدے میں ربط کے

اس عتابِ بے سبب نے "محوِ حیرت" کر دیا — واقفِ رنج و غم و دردِ محبت کر دیا

کائنات دل کو محرومِ مسرت کر دیا　　گلشنِ امید کو مایوس نکہت کر دیا
دل پھڑک کر رہ گیا میں، دم مچل کر رہ گیا
نالۂ دل، دل ہی میں کروٹ بدل کر رہ گیا
پھیر کر منہ باغ سے جب دم وہ رخصت ہو گئی　　مجھ پہ طاری ہجر کی جانسوز غفلت ہو گئی
میری مونس میری ہمدم دل کی حسرت ہو گئی　　سوزشِ قلب و جگر سے خاص لعنت ہو گئی
سازِ ہستی اب مرا حافظ اذیت کوش ہے
ہر نفس سرمایہ دارِ نغمہائے دوش ہے

حافظ غازیپوری

اعجازِ علم

اے علم تو نے دنیا کو روشنی عطا کی　　انجم کی بزم میں ہے شہرت تری ضیا کی
لوحِ فلک پہ کندہ نقش و نگار تیرے　　ارض و سما کے مالک ہیں رازدار تیرے
سیارے تیر خط پر کار چڑھتے ہیں　　دنتے ہیں اپنا سر اور رہ رہ کے جھومتے ہیں
تو حسن لم یزل ہے، اللہ ری تیری تقدیر!!　　مہ تیرے آئینہ میں تکتا ہے اپنی تصویر
آتشکدہ میں تیرے ہیں برق کے شرارے　　اور تیری بزم کے ہیں فانوس ماہ پارے
تارِ نفس سے تیرے قائم ہے سازِ ہستی　　وابستہ جستجو سے تیرے ہیں رازِ ہستی
ایوانِ آسماں سے اوپر رسائی تیری　　قصرِ جناں میں ہر سو جلوہ نمائی تیری
قلزم کی وادیوں میں موتی دکھائے تو نے　　آبِ رواں کی تہ میں گلشن اگائے تو نے
اوجِ فضا میں اپنی محفل سجائی تو نے　　موجِ ہوا پر اپنی کشتی اڑائی تو نے
صحرا کی خاک تک میں گلشن کے رنگ بھرنا!　　واللہ تیری خو ہے فطرت سے جنگ کرنا

محمود اسرائیلی

پرستش خیال

(ایک تصویر کو دیکھکر)

جلوہ ہائے عظمت تقدیس کی دنیا ہے تو
فطرتِ معصوم کا اک موجزن دریا ہے تو

پاکیوں کے نور خوابیدہ تیری تصویر میں
عصمتوں کے خواب پوشیدہ تری تعمیر میں

تیرا ہر انداز درس عصمتِ جذبات ہے
تیرا ہر پیغام تفسیرِ الٰہیات ہے

اے جمیلہ۔ شاہد قدرت ہے شیدائی تری
اے حسینہ۔ لیلیِ فطرت ہے سودائی تری

بہ رہے ہیں چشمہ ہائے نور قدموں میں ترے
لوٹتا ہے جلوہ زار طور قدموں میں ترے

یہ ادائے والہانہ یہ نگاہ پاک باز
ہیں انھیں جلووں میں پنہاں عصمتِ فطرت کا راز

عصمت آبادِ حیا آرا تری تخئیل ہے
تو علوئے عظمت انسان کی تکمیل ہے

"بیت" کے جذبات سے لبریز ہے دنیا تری
آہ بے اندازہ الفت خیز ہے دنیا تری

جلوہ ہائے حسن پاکیزہ کا گہوارہ ہے تو
فطرتِ معصوم کا اک پاک نظارہ ہے تو

دستگیر حاملان عرش ہے عظمت تری
احترام ساکنان فرش ہے عصمت تری

تو سرورِ عصمتِ جذبات سے سرشار ہے
"بے نیاز دہر" تری فطرتِ خود دار ہے

جستجو کی وسعتوں سے دور ہے دنیا تری
پردۂ تقدیس میں مستور ہے دنیا تری

تو بھی اک غنچہ ہے لیکن بے نیاز رنگ و بو
تو بھی اک گوہر ہے لیکن تاجدار آبرو

تیری عصمت عظمتِ انسان کی تاسیس ہے
اے مقدس نازنیں! تو چشمۂ تقدیس ہے

تیری ہستی عصمت قدرت کا استحکام ہے
تو خدائے قدس کا اک دلربا پیغام ہے

میں اگرچہ عظمت تقدیس سے محروم ہوں
شکر کرتا ہوں کہ تیرے عشق میں معصوم ہوں

روشن صدیقی

حیات

سایۂ تیغ میں بھی جب میں نے قضا نہ کی نماز
دہر میں عام ہوگیا میرا فسانۂ نیاز

کھوئے گئے ظہور میں ڈوب گئے سرور میں
تیرا پیام غم رہا تیرا کلام دل نواز

تاروں کا خوں نچوڑ کر خاک نثار دے گیا
عرصۂ دہر میں مگر کھول سکا نہ تیرا راز

جلوۂ مہ کہاں گیا جوشِ بہار کیا ہوا
تشنۂ بے ثبات ہے حسن پہ کیا غرور ناز

زاہدِ پُر فریب کا کیجیئے اعتبار کیا
شیخ حرم سے دوستی پیر مغاں سے ساز باز

حُسن غلام ہو کے بھی کتنا شکوہ دار ہے
دیدۂ غزنوی سے تو دیکھ ذرا رُخ ایاز

تجھکو مرے علاج کا فکر عبث ہے چارہ گر
تیری دوائیں بے اثر عشق کا درد جانگداز

تارے بھی آسمان پر چشم پُر آب ہو گئے
رات کسی کے ہجر میں دیکھ کے میرا سوز و ساز

سچ ہے وہ بدنصیب ہی لطفِ حیات پا گیا
جس کی شبِ فراق ہے عمر خضر سی بھی دراز

میری زبان میرا دل [illegible] غلام ہو چکے
دین مرا تری رضا ذکر ترا مری نماز

مست نشاط ناخدا بحرِ حیات موجزن
تیرے سپرد اے خدا میری مراد کا جہاز

بادہ گسار ہوگیا سارا جہان اے نظیر
دیکھ کے میرے ہاتھ میں ساغر بادۂ حجاز

نظیر لودھیانوی

اسباب مخاصمت

(۱)

کچھ تجھکو خبر ہے ترا دشمن ہے فلک کیوں؟ معلوم بھی ہے تیری مخالف ہیں ملک کیوں؟

مجبور ہیں وہ

صاحب کردار ہے تو ہی

مختار ہے تو ہی

(۲)

کیوں شام و سحر ہیں ترے نقصان کے درپے؟ اے زندۂ جاوید! تری جان کے درپے؟

غصہ ہے انہیں

کیوں تری قسمت میں بقا ہے؟

تو چیز ہی کیا ہے؟

(۳)

کیوں درپے آزار زماں بھی ہے مکاں بھی؟ میں تجھکو بتا سکتا ہوں یہ راز نہاں بھی

تھا غرۃ انھیں

وسعت و پہنائی پہ کیا کیا!!

جو تو نے مٹایا

(۴)

بت تبکدۂ ہست کے ایمان کے دشمن ایمان کے دشمن ترے عرفان کے دشمن

ہے ان کو حسد

کیوں تجھے وجدان ملا ہے؟

ایقان ملا ہے؟

امین حزیں

غزل اثر رامپوری

سوئے در آنکھیں لگی ہیں اور سراپا گوش ہے
مرنے والے میں ابھی اتنا تو باقی ہوش ہے

وہ اُدہر آئینگے جائینگے ادہر صبر و قرار
انتظار دوست تمہید وداع ہوش ہے

یہ سوادِ شامِ غم کا رنگ بھی ہے دیدنی
آسماں پر آج تاروں کی فضا خاموش ہے

وہ معما ہے یہ انساں بھی جو حل ہوتا نہیں
اس قدر کم فہم بھی ہے جسقدر ذی ہوش ہے

تیرے سودائے محبت میں کمی پاتا ہوں کچھ
یہ سر شوریدہ اب مجھکو وبالِ دوش ہے

کس قدر دلچسپ ہے افسانۂ حسن و جمال
کائناتِ دل کا ہر ذرہ سراپا گوش ہے

ہے زمانہ سے جدا رسمِ جہانِ عاشقی
ہوگیا بیہوش جو اسمیں وہی باہوش ہے

شک نہیں اسمیں کہ مستقبل ہے اُسکا شاندار
آج جسکو فکرِ فردا ہے خیالِ دوش ہے

پیشِ جاناں صورتِ تصویرِ حیرت ہوں اثر
حالِ دل کہتی ہیں آنکھیں اور زباں خاموش ہے

جگر بریلوی

جان اُن پر نثار کرتا ہوں — مژدہ اے زندگی کہ مرتا ہوں
شوق نے کر دیا ہے دیوانہ — ذرے ذرے کو سجدہ کرتا ہوں
دل میں دیتا ہوں دعوتیں غم کو — اپنا پیمانہ آپ بھرتا ہوں
آج قابو نہیں رہا دل پر — ہوک اٹھتی ہے نالہ کرتا ہوں
لا رہا ہوں انھیں تصور میں — اپنے خاکہ میں رنگ بھرتا ہوں
ہو نہ جائے یہ باعثِ پندار — تیرے لطف و کرم سے ڈرتا ہوں

کیا کہوں زندگی کا حال جگر
جبر سہتا ہوں ضبط کرتا ہوں

خواجہ مسعود علی ذوقی

اقلیم دل کو عشق نے ویراں بنا دیا — اک آرزوئے خام کا زنداں بنا دیا
اُف وہ نگاہِ لطف کی بیجا نوازشیں! — خود چشم التجا کو پشیماں بنا دیا
رند آشنائے لذتِ درمان عشق نے — صہبائے غم کو بادۂ عرفاں بنا دیا
پھر کیوں اسیر بندشِ ایماں کیا مجھے — جب آشنائے لذتِ عصیاں بنا دیا
دیر و حرم پہ وہ میرے دل کا تقاضائے شوق تھی — وہ چیز جس نے غم کو فراواں بنا دیا
میں اس خرام ناز کی شوخی کو کیا کہوں — ویرانیوں کو جس نے گلستاں بنا دیا
اس طرح تیری یاد نے نشتر چبھوئے ہیں — تارِ نفس کو تارِ رگِ جاں بنا دیا

محویتِ جنوں میں وہ ذوقی کی بے خودی
دامانِ غیر کو بھی گریباں بنا دیا

راز رامپوری

علاج کیا ہے زمانہ کی دشمنی کے لئے — کہ موت بھی تو نہیں میری زندگی کیلئے
اگر یہی ہیں نشاط مذاق کے معنے — مجھے تباہ بھی کر دیجے دلگی کیلئے
فلک بھی دوست ہوا اُسکا تو فائدہ کیا ہی — جسے اک آپ سا ملجائے دشمنی کیلئے
نتیجہ اس دلِ بیمار کا خدا جانے — نہ موت ہی کیلئے ہے نہ زندگی کیلئے
نہیں ہے اہل زمانہ سے کچھ اُمید مجھے — یہ لوگ سب ہیں تماشائے بیکسی کیلئے

وفا کی موت بڑے خوش نصیب مرتے ہیں | یہ دن تو ورنہ زمانہ میں ہے سبھی کیلئے
فلک خلاف زمانہ عدو ہے تم دشمن | قضا نہ آئے تو کون آئے دوستی کیلئے
حدودِ ظاہر و باطن میں فرق ہے اتنا | کہ موت مال ہو دل کی تونگری کیلئے
حجابِ عقل کی نیرنگیاں یہ فرضی ہیں | چمن میں روئے کو شبنم ہے گل ہنسی کیلئے
مرا قصور ہے معیار آدمیت کا | کہ راز ختم ہے معصومیت بنی کیلئے

کیفی چریاکوٹی

اُن کی الفت میں مٹ چکا ہوں میں | وہ اگر جان ہیں تو کیا ہوں میں
دم لبوں پر یہ آکے کہتا ہے | زندگانی کا انتہا ہوں میں
مجھ کو جو بزم سے نکال دیا | کیا رقیبوں کا مدعا ہوں میں
تم جو دینے پہ مجھکو آؤ گے | تم کو مانگوں گا وہ گدا ہوں میں
کچھ رسائی کی راہ نکلے گی | تم جو آؤ تو نقشِ پا ہوں میں
ہوش تھا جب تھی جستجو اُن کی | مل گئے وہ تو کھو گیا ہوں میں
دم لبوں پر کبھی نہیں آتا | نالہ ہر چند کھینچتا ہوں میں
دیکھ! اے مجھ کو دیکھنے والے | کس طرح تجھکو دیکھتا ہوں میں
کردے آہِ سحر مجھے ٹھنڈھا | رات بھر بزم میں جلا ہوں میں
اس کی محفل کی کچھ نہ پوچھ اے دل | درد کی شکل میں اُٹھا ہوں میں
اب سرِ بزم پی نہیں سکتا | سب یہ کہتے ہیں پارسا ہوں میں
وہ سمجھ میں جو کچھ نہیں آتا | بُت بھی کہنے لگے خدا ہوں میں
کعبہ یا دیر سے مجھے کیا کام | اس کے در پر پڑا ہوا ہوں میں
اپنا مذہب یہی ہے اے کیفی | بندۂ شاہ کربلا ہوں میں

ڈائری کا ایک ورق

چاند کا سفر

موسم بہار شباب پر ہے لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ
پہلے شگفتہ ہوتا ہے دل، بعد کو گلاب
تو مجھے کہنا چاہئے کہ :-
اَب کے خزاں بہار سے پہلے ہی آگئی

رات زیادہ گزر گئی ہے۔ ساری دنیا محوِ خواب ہے اور میں اوپر کی منزل میں تنہا بیدار۔ خلوت کی بیداری بھی کس قدر عجیب ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پردہ آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا ہے اور اس کے نقوش یکے بعد دیگرے نگاہ کے سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں، ماضی کی داستان بھی کس قدر پُر لطف داستان ہے، اور کتنی حسرتیں ہماری اس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں، حال تو گویا ماضی کا نقطہ ہے کہ خود اس کا کوئی وجود نہیں ہے، لیکن تمام خطوط و دوائر اسی کی جنبش کا نتیجہ ہیں، مستقبل نام ہے صرف توقعات کا موہومات کا، تمناؤں کا، لیکن توہمات پر انسان جی تو سکتا ہے، مسرور نہیں ہو سکتا، اس لئے ایک ذرا پختہ عمر کے انسان کے لئے بہترین مشغلہ تنہائی کا یہی ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے واقعات پر غور کرے، گزری ہوئی باتوں کو یاد کرے اور اگر ایام شباب گزر گئے ہیں تو رات کا بڑا حصہ اس کے ماتم میں صرف کر دے سکم ہیں وہ لوگ جن کا شباب ان کی تمناؤں کے اندازہ سے خوشگوار بسر ہوتا ہے، اسلئے عہدِ ماضی کے افسانہ کا یہ ٹکڑا جسقدر بھی حسرت انگیز ہو کم ہے۔ لوگ وقت گزر جانے پر بھی امیدوں کی فرضی دنیا قائم کرتے رہتے ہیں اور پھر خود ہی مایوس ہو کر اُس مسمار کر دیتے ہیں۔ یہ ہیں انسانی بے بال وپری کے آخری حدود! دیر تک دماغ میں مختلف خیالات آتے رہے اور پھر کچھ دیر تک فلکیات کے بعض مسایل پر غور کرتا رہا اور چاند کی خنک آب وتاب میں آنکھ بند کر کے لیٹ رہا۔

....

....

جیسے کسی نے یہ کہکر جگا دیا ہو کہ، ہوائی جہاز طیار ہے۔ ہاں، یاد آیا مجھے بھی تو سفر کرنا تھا، اُٹھا داڑھی مونڈی، کنگھا کیا، کپڑے بدلے، گرم کپڑوں کا صندوق، موٹے موٹے کمبلوں کا بستر اور ایک بکس مختلف ضروری چیزوں کا خادم کے ذریعے موٹر تک پہونچایا اور چلدیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خیال آیا کہ ٹکٹ تو نہیں بھول آیا، جیب میں ہاتھ ڈالا تو موجود تھا۔ یہ ٹکٹ ایک سال کا موسمی ٹکٹ تھا اور عمومی تھا، عمومی سے مراد یہ کہ میں کرۂ ارض کے ہر مقام سے سفر کر سکتا تھا، اور کرۂ قمر کے ہر مقام تک جا سکتا تھا۔ مٹروپولیٹن

کمپنی چونکہ سب سے زیادہ معتمد علیہ کمپنی تھی اور اس کے جہاز بھی نہایت تیز رو اور آرام دہ ہیں اس لئے کرایہ تو ضرور زیادہ ادا کرنا پڑا، لیکن میں نے اسی کو ترجیح دی اور آخر کار سب کو خیر باد کہہ کے اس کرہ کی سیاحت کے لئے چل دیا جس کے تابناک وجود کی ہمارے کرۂ ارض کے بہت سی عشق خیز راتیں گردیدۂ احسان ہیں۔

دس منٹ میں پولو گرونڈ کے میدان میں پہونچ گیا اور کپتان کو ٹکٹ دکھاکر غیر ضروری سامان، چھت کے ایک کمرہ پر رکھواکر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا، ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی بادلوں کے ٹکڑے کہیں کہیں نظر آتے تھے، لیکن بالکل دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہلکے اور تُنک ــ بگل کی بلند آواز بلند ہوئی، جھنڈا کھول دیا گیا اور سامنے کا پہیہ گردش کرنے لگا۔ ہلکی سی جنبش ہوئی اور تین پہیوں کے اوپر جہاز تھوڑی دور چلکر فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا۔

میرے علاوہ نو آدمی اور بھی تھے جن میں سے تین عورتیں، دو نوجوان لڑکیاں اور چار مرد تھے، یہ سب امریکہ کے باشندے تھے اور براہ راست وہیں سے سوار ہوئے تھے۔ یہ جہاز دو درجوں میں منقسم تھا، اوپر کا درجہ اسباب کے لئے تھا اور دوسرا بیٹھنے، سونے اور کھانے کے لئے، لیکن ہر کام کے لئے مختلف حصے تھے، کپتان کے کمرہ میں ایک طرف لاسلکی ٹیلیفون اور ریڈیو لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف ایک بڑی گھڑی نہایت ہی پیچیدہ مشینری کی نصب تھی جسکے ذریعہ سے درجۂ حرارت، موسمی کیفیت طول البلد، عرض البلد، درجات فلکی اور خدا جانے کیا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔

میری جگہ بالکل دریچہ کے پاس تھی اس لئے بلند ہوتے وقت نہایت اچھی طرح محسوس کرتا جاتا تھا کہ تمام مکانات اور درخت وغیرہ کس طرح چھوٹے ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد شہر کا بلند مینار صرف ایک چھوٹا سا دھبہ نظر آنے لگا، سردی بھی بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی بادل کے ٹکڑوں کے اندر سے ہم کو گزرنا پڑتا تھا، لیکن یہ بادل بالکل خشک تھے اور دریچوں کے شیشوں پر ایک ہلکے سے نم کے علاوہ اور کوئی اثر نہ پیدا کرتے تھے۔

جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس جہاز کے تمام مسافر بھر گئے ہیں اور اب براہ راست بغیر راہ میں کہیں قیام کئے ہوئے سیدھے کرۂ قمر تک کا سفر کرنا ہے تو میرے اعصاب میں اک خاص قسم کی بے چینی محسوس ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ دیکھئے وہاں کیونکر گزرتی ہے اور کس طرح واپسی ہوتی ہے۔

جہاز کی رفتار نہایت تیز ہوتی جاتی تھی اور سامنے جو رفتار پیما لگا ہوا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اس وقت ہم ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ ابھی اس کی دوچند رفتار اور بڑھیگی۔ میں بیٹھا ہوا اپنی اس نئی سیاحت کے متعلق غور کر رہا تھا کہ خادم آیا اور میرے سامنے کے مسافر کے پاس ایک تار لایا جو اسوقت لاسلکی کے ذریعہ سے موصول ہوا تھا۔ یہ اسے دیکھکر فوراً اٹھا اور ٹیلیفون کو امریکہ کے کسی کارخانہ سے ملاکر کاروبار تجارت کے متعلق کچھ ہدایات کرنے لگا۔

میں سخت حیران تھا کہ اس وقت جب کہ جہاز کم از کم ۲۰۰ میل کی بلندی پر فضا میں اڑ رہا ہے کیونکر امریکہ کے کسی آدمی سے براہ راست گفتگو کرنا ممکن ہے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے جو میرے سامنے ہو رہا تھا اور کوئی وجہ اس سے انکار کی نہ تھی۔

دن بھر کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی۔ کیونکہ اب کرۂ ارض کا کوئی حصہ ہمکو نظر نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا جہاز صرف آسمان کے نیل میں تیرتا ہوا جارہا ہے، ہوا چونکہ ۱۰۰ میل کے بعد ہی ختم ہوگئی تھی اس لئے ہر شخص کے منہ سے آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور نبض کی رفتار ۱۵۰ فی منٹ تک پہونچ گئی تھی۔

شام کو چاند کے طلوع کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور وہ آج ہم سے زیادہ قریب نظر آتا تھا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ ہم لوگ کھانا کھاکر سنیما دیکھ رہے تھے، کرۂ قمر سے ایک لاسلکی پیغام کپتان کو موصول ہوا، کپتان ہم لوگوں کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا کہ چاند کے بڑے سمندر میں شدید سیلاب ہونے کی وجہ سے جلد وہاں پہونچنا خطرہ سے خالی نہیں ہے اس سلئے یہ سفر کم از کم دس دن اور بڑھ جائے گا، کیونکہ جہاز کی رفتار کم کرنا ہوگی۔ بعض کو اس خبر سے خوشی ہوئی، بعض کو رنج، لیکن میں نے اس کو مذاق سمجھکر کوئی اثر نہیں لیا اور سامنے پردہ پر نہایت لطف کے ساتھ میری پکفورڈ کی ایکٹینگ کو دیکھتا رہا، میں زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کرونگا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ حقیقتاً اب جہاز میں کوئی نیا تجربہ نہ ہوتا تھا، وہی کھانا پینا، سنیما دیکھنا اور سوجانا روز کا مشغلہ تھا، اب میرے مراسم لوگوں سے کافی طور پر بڑھ گئے تھے، اور اس لئے بعض اوقات برِج کھیلنے میں بھی مشغول ہوجاتا تھا ایک دن البتہ جہاز کا انجن کچھ برہم سا ہوگیا تھا اور جہاز نیچے کی طرف مائل ہونے لگا تھا، لیکن کپتان نے فوراً دوسرا انجن کھولدیا اور پانچ میل سے زیادہ نیچے نہ اترے تھے کہ جہاز پھر تازہ قوت کے ساتھ صعود کرنے لگا۔ بیس دن کے بعد ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار بہت بڑھ گئی لیکن رفتار پیما صفر پر ہے تھوڑی دیر میں کپتان مسکراتا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا سفر تو حقیقتاً آج ختم ہوگیا، اور اب ہمارا کوئی کام باقی نہیں رہا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ ہم کشش زمین کی حدود سے نکل کر کشش قمر کی حدود میں آگئے ہیں تو میں اسکا مدعا سمجھا۔ الغرض ہم چاند کی طرف خود اپنی قوت سے نہیں جارہے تھے۔ بلکہ چاند خود ہمیں اس طرح کھینچ رہا تھا جس طرح زمین پر کوئی ڈھیلا اوپر کی طرف پھینکئے اور وہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف مائل ہو۔ جہاز اس وقت زمین کی طرف اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ چاند کی کشش دفعتہً اسے نہ کھینچ لے اور اس طرح یہ خطرہ باقی نہ رہا تھا کہ ہم چاند میں پہونچکر دفعتہً کسی چیز سے ٹکرا جائیں گے۔ اسوقت سب سے زیادہ حیرت انگیز تجربہ میرے لئے یہ تھا کہ میرا بدن بالکل ہلکا ہوکر پھول سا ہوگیا تھا۔ اور جسوقت میں قدم اٹھاتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُڑ رہا ہوں۔ باقی ۔۔۔۔۔۔ باقی

نیاز

باب الاستفسار

مسئلہ معاد

مولانا!

نگار کے اکتوبر نمبر میں آپنے تصدق حسین صاحب کے سوال نمبر (۷) کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "بہشت و دوزخ کے بیانات سب تمثیلی ہیں، اور لوگوں کے سمجھانے کے لئے اصل میں انکا تعلق صرف روحانی مسرت و اذیت سے ہے"

بیسویں صدی عیسوی کی یہ تاویلات قرآنی میں نے اکثر سنیں اور عموماً اس فرقہ سے جو اسوقت تہذیب و تمدن کا علم بردار ہے مجھے اس کے متعلق آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ غالباً آپ اسپر توجہ فرمائینگے،

مسرت و اذیت ہر دو کیفیات احساسی ہیں، اور ان کے لئے پہلے محرک اور سبب کا وجود ضروری ہے۔ اگر بہشت و دوزخ سے مراد مسرت و اذیت روحانی بھی ہو تو حسب قاعدہ مسرت و اذیت کے محرک اور سبب کا وجود سے مقدم ہوگا۔ اب قابل دریافت یہ امر ہے کہ حیات بعد الموت میں وہ محرک اور سبب کیا چیز ہوگی اور کس طرح انسانی روح پر مسرت و اذیت کے جذبات طاری ہوں گے۔ کسی مفید اور کارآمد چیز کی یافت سے انسان خوش ہوتا ہے اور اس کے فوت ہو جانے سے غمگیں۔ حیات بعد الممات میں کس چیز کی یافت سے ہم مسرور ہوں گے اور کس چیز کی نایافت سے مغموم۔

آپ روحانی مسرت و اذیت کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ روحانی مسرتیں اور اذیتیں ضرور رہم ہیں۔ مگر ایسی روحانی خوشی اور اذیت جسکے ساتھ جسمانی خوشی اور ذیت شامل نہ ہو اتنی قابل اعتنا نہیں۔ غم عشق ضرور جاں گسل ہے مگر ان کے ساتھ ہی اگر سر بازار ہر روز بلا ناغہ عاشق جانباز کے کوڑے بھی پیٹے جائیں۔ تو پھر یہ تکلیف بدرجہا زیادہ اذیت رساں ہوگی۔ لیکن مجھے تو اس میں بھی کلام ہے کہ روح کے لئے ایسی روحانی مسرت یا اذیت کا وجود جب روح جسم سے علیحدہ ہو۔ ممکن بھی ہے یا نہیں، کیونکہ ہمارے لئے کسی ایسی حالت کا اندازہ جب ہماری روح کا پیوند جسم سے نہوا تھا محالات سے ہے۔ پھر آخرت جو دنیاوی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے۔ کس طرح ایک ایسی خوشی یا اذیت سے عبادت ہو سکتی ہے جسکو کوئی فرد بشر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور وہ انسان جو ہوا و حرص کا بندہ اور خواہشات نفسانی کا حلقہ بگوش ہے کیسے فقط مسرات روحانی پر اکتفا کرنے کے لئے تیار ہوگا؟

اگر بہشت و دوزخ کے بیانات تمثیلی ہوں اور اس سے مراد روحانی مسرت و اذیت ہو۔ تو ضرور ہے کہ ان روحانی مسرتوں اور اذیتوں سے صرف روح متمتع ہو اور بے چارہ جسم جس نے روح کا دنیا کی ہر دشوار گزار گھاٹی میں ساتھ دیا۔ جس کے سینے دشمنوں کے تیروں اور گولیوں سے چھلنی ہوگئے جس کے ہاتھ پاؤں قلعہ شکن توپوں اور ہوائی بم بازجہازوں کے نذر ہوگئے، اور جس کے سر و دوش اینٹوں سے زخمی اور چور کئے گئے، بے یار و مددگار پیکر خاک ہوجائے، اور زمانے کے جھکڑ اور آندھیاں اسے اڑا کر نیستی کے سمندر میں غرق کردیں، کیا اس وقت اسے حق نہ حاصل ہوگا، کہ زبان حال سے چلا چلا کر گلا پھاڑ پھاڑ کر دربار رب لایزال میں رو رو کر یوں عرض کرے۔ فاذا تکون کریھۃ ادعیٰ لھا۔ واذا یحاص الحیص یدعی جندب۔ اس دنیا کے کاروبار میں روح اور جسم مسرت و اذیت میں برابر کے حصہ دار ہیں (روحانی) مسرت سے اگر طبیعت خوش ہوتی ہے تو جسم کا بھی اس میں برابر کا حصہ ہے اور جسمانی اذیت سے روح کے لئے بھی تکلیف اذیت ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا، کہ جب موت کے بعد انسان کے اعمال و افعال کا باقاعدہ جائزہ لیا جاتا ہے اور اسے اعمال کے مطابق مسرت یا اذیت کا حق دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ تو اس وقت جسم کو کیوں نظرانداز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ روح کو جس مسرت یا اذیت سے اب دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کا ارتکاب جسم کی معرفت عمل میں آیا تھا۔ ورنہ صرف روح ہرگز اس قسم کے جرائم یا اعمال حسنہ کا ارتکاب نہ کرسکتی۔ اگر یہ صحیح ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ جسم کو بھی اس مسرت و اذیت میں برابر کا حصہ دار نہ قرار دیا جائے؟

آپ کو یاد ہوگا، کہ گزشتہ جنگ بلقان میں بلغاریا اور سرویا نے کس طرح اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر ایڈریانوپل فتح کیا تھا۔ کیا آپ ان کی اس خوشی کا اندازہ لگاسکتے ہیں جو انہیں اس فتح سے حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر کوئی فیلسوف ان سے اسوقت یہ کہتا۔ کہ جسمانی منافع اور خوشیوں سے روحانی خوشیاں اور منافع بدرجہا دلاویز تر ہیں اور تم حیات بعد الممات کی خوشیوں اور اذیتوں کو بھی اسی قبیل سے قرار دیتے ہو۔ کیا اچھا ہو۔ اگر تم ان خوشیوں سے مماثلت پیدا کرنے کے لئے ایڈریانوپل کو بعد فتح کرنے کے پھر ترکوں کے حوالہ کردو، کیونکہ تمہیں فتح سے جو روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے وہ کیا کم ہے، اور انہیں جو شکست سے روحانی اذیت اور انفعال حاصل ہوا ہے کیا تھوڑا ہے؟

تو اگر اسوقت کوئی کوئی صلیب پرست فلاسفر جواباً یہ عرض کرسکتا ہے کہ ایڈریانوپل کی فتح سے جو مادی نقصانات ہم کو برداشت کرنا پڑے ہیں اُن کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ اور آپ اس پہلو کو کیوں نظرانداز کررہے ہیں؟ تو کیا رب ذوالجلال کے دربار میں جسم کی طرف سے کوئی وکیل یہ نہیں کہہ سکتا کہ

دنیا کے سرد و گرم، تر و خشک خیر و شر میں جب جسم روح کے برابر شریک تھا۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ اب جسم کو ان لذائذ سے تمتع کا کوئی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ جس طرح ایڈیا نوپل فتح کے بعد تلوار سے ہی واپس لیا جا سکتا ہے اور فاتح نقطۂ روحانی مسرت پہ اکتفا نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ جسمانی پہلو سے بھی حظ اندوزی کا طلبگار رہے۔ بالکل اسی طرح حیات بعد الممات میں بھی جسم روح کے دوش بدوش ہوگا۔ اور اپنے حقوق کے لئے داد فریاد کریگا۔ اور کوئی بھی ایسا نہ ہوگا۔ جو صرف روحانی مسرت کے کھلونے سے بہل جائے۔

اسلام نے راہبانہ زندگی سے اپنے پیرؤوں کو اسی لئے منع فرمایا۔ کہ وہ جسمانی پہلو کو نظر انداز کر کے لذائذ دنیا سے تنفر ظاہر کرتے ہیں حالانکہ اس حکیم علی الاطلاق کا انسانی تخلیق سے بالکل یہ مدعا نہ تھا۔ کہ وہ اپنے اس قدر مہتم بالشان حصہ کو نظر انداز کر دے، بلکہ یہ تعلیم دی جاتی ہے۔ کہ ہم نہایت فراخدلی سے جائز طور پر لذائذ دنیوی سے بہرہ ور ہوں اور نہایت شد و مد سے ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ کہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (۱۸ - نور)

وعدۂ الٰہیہ کے پہلے جزو میں ہم کو ایک مادی چیز عنایت فرمائی جاتی ہے۔ جس سے ہمارے جسمانی پہلو کی رعایت مقصود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس معجون (انسان) میں غالباً جسمانی پہلو روحانی پہلو سے زیادہ قابلِ اہتمام ہے۔ وعدے کا دوسرا جزو روحانیت اور جسمانیت دونوں سے مرکب ہے اور تیسرا خالص روحانی ہے۔ لیکن یہ امر کس قدر تعجب انگیز ہوگا۔ کہ حیات بعد الممات میں جسمانی پہلو کو بالکل بھلا دیا جائے، اور ایک نہ ختم ہونے والی زندگی روحانی (فرضی) مسرتوں میں بسر کرنا پڑے۔ اسی طرح حیات بعد الممات میں اگر جسمانی پہلو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام راہبانہ زندگی کے برخلاف کیوں زور و شور سے پروٹسٹ کر رہا ہے۔ حالانکہ جب آخری زندگی سراپا روحانی مسرتوں اور اذیتوں سے لبریز ہے تو اس شخص کو کیوں قابلِ تحسین و آفرین نہیں خیال کیا جاتا۔ جو اپنی دنیوی اور اخروی زندگی میں مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

نبی اور مرسل کو روح القدس سے جو قریب کا تعلق ہوتا ہے وہ کسی اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔ لیکن جسمانی لذائذ کچھ اس قدر دلربا واقع ہوئے ہیں کہ وہ بھی باقاعدہ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ حالانکہ جب اخروی زندگی بالکل ہی روحانی زندگی ہے۔ تو کیا یہ قرین قیاس نہیں کہ پیغمبر اس زندگی کا مکمل

نمونہ ہوتا ہے ، جبکہ نبی کی بعثت کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو اس سفر کے لئے تیار کرے لیکن سنئے، دنیا کا سب سے بڑا انسان کیا کہہ رہا ہے۔

حُبِّبَتْ اِلَیَّ مِن دُنْیَاکُمْ ثَلَاثَۃٌ ۔ اَلطِّیبُ، وَالنِّسَاءُ وَقُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ ۔

یہاں بھی آپ دیکھہ سکتے ہیں کہ کس طرح ترتیب مدارج منظور ہے (۱) عورت (۲) طیب (۳) الصلوۃ اگر بہشت و دوزخ روحانی مسرت و اذیت کی دوسری تعبیریں قرار دی جائیں تو کیا یہ سراپا ابلہ فریبی نہیں کس قدر مضحکہ خیز امر ہے کہ اسد کہہ کر رجل شجاع مراد ہو اور اس تاویل کے لئے ذرا بھر بھی گنجائش نہ ہو اور نہ کوئی قرینہ صادقہ موجود ہو۔ روحانی مسرتوں اور اذیتوں کو حور و قصور، اور دوزخ وہاویہ سے تعبیر کرنا معنی الشعر فی بطن الشاعر کے قبیل سے ہے۔

۸ کروڑ مسلم آبادی میں اسوقت فی لاکھ کتنے آدمی ایسے ہوں گے، جن کا یہ عقیدہ ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد روحانی مسرت و اذیت ہے عوام جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔ ہرگز جسمانی پہلو کو نظر انداز کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اگر وہاں بقول آپ کے روحانی مسرتوں اور اذیتوں کا ہی انتظام ہے تو عوام جن کی ساری عمر دوزخ کے ڈر اور بہشت کے شوق میں بسر ہوئی، خدائے متعال کی اس ابلہ فریبی کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جبکہ اُنکی پیاس بجھانے کے واسطے کافی سامان نہ ہونگے اور کیا اس وقت کہا جاسکتا ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد روحانی مسرت اور اذیت تھی۔ اگر کسی نے کہہ بھی دیا تو کیا ادھر سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ

تکلم الناس علی قدر عقولھم ۔

ممکن ہے۔ آپ یہ فرمادیں کہ قرآن نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون

لیکن اسوقت اگر اہل الذکر کی کسی کو جستجو بھی ہو تو ۸ کروڑ مسلم آبادی سے کتنے آپ کے ہم خیال اہل الذکر پیدا ہوں گے ہاں پھر ارشاد ہے کہ

فاتبعوا السواد الاعظم اور

ولا تجتمع امتی علی الضلالۃ

غلام ربانی عزیز

(نگار) یہ استفسار یا اعتراض مولوی غلام ربانی عزیز کا دو سال سے میرے پاس سے محفوظ ہے اور اس نمونہ فکر میں بسر ہو بارہا میری نظر سے گزرا، لیکن ہمیشہ "میں نے موقوف اسے وقت دگر پر رکھا" ایک زمانہ سے میرے اوقات کا

کہ خالق و مخلوق کا تعلق کس نوع کا ہوسکتا ہے تخلیق انسان کی غایت کیا ہے؟ قدرت ہم سے کیا توقعات رکھ سکتی ہے - اور مذہب کس حد تک اس معمہ کے حل کرنے میں کامیاب ہوا ہے، پھر اسی ایک خیال کے ماتحت چونکہ طاعات و عبادات کے مسائل، معاد و آخرت کے عقاید انبیا و رسل کے الہامات، عالم کون کے سلسلہ ہائے علت و معلول، اور وہ تمام باتیں جو ایک مذہبی لٹریچر سے متعلق ہوسکتی ہیں سبھی پر غور کرنا پڑا اس لئے ظاہر ہے کہ بہشت و دوزخ کے قصے بھی میرے سامنے آئے ہوں گے اور میں نے اُن کے متعلق بھی کوئی رائے قائم ہوگی، لیکن میں خود ایک عرصہ تک اس باب میں متفکر و متردد رہا اس لئے جی نہ چاہا کہ بغیر خود اپنا اطمینان نفس حاصل کئے بغیر دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کروں - قبل اس کے کہ میں اصل مقصود پر آؤں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا مسلمان ہونا (اگر میں واقعی مسلمان ہوں) اس بنا پر نہیں کہ میرے آبا و اجداد اس مذہب کے پیرو تھے، بلکہ مسلمان ہوں اسلئے کہ میں نے تمام مذاہب کے لٹریچر کا نہایت غایر اور وسیع مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اگر انسان کو مذہب کی ضرورت ہی تو اسلام سے بہتر کوئی اور مذہب اس کے لئے نہیں ہوسکتا کیونکہ اس سے زیادہ سادہ، لیکن ہمہ گیر تعلیمات کہیں اور نہیں پائی جاتیں پھر ظاہر ہے کہ اس صورت میں میرا اسلام کوئی تقلیدی چیز نہیں ہے اور نہ تقلید محض ایک شخص کو کسی مسلک یا مذہب کا سچا پیرو بنا سکتی ہے "نفس مطمئنہ" نام کورانہ اتباع کا نہیں، بلکہ اجتہاد انہ تفکر و تدبر کا ہے اور یقیناً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر شخص کو ہر زمانہ میں تنقید کی دعوت دے سکتا ہے اور کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ بغیر غور کئے ہوئے اس کی تعلیمات کو قبول کرے -

بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس سلسلہ میں، جہاں اور بہت مسائل پر غور کرنا پڑا، میں نے اس خاص مسئلہ پر بھی نہایت آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کی اور اگر مجھے اندیشہ نہ ہو کہ لوگ میرے مفہوم کے سمجھنے میں غلطی کریں گے تو میں نہ صرف یہ کہونگا کہ بہشت دوزخ اصطلاحی الفاظ ہیں روحانی لذت و الم کے لئے بلکہ یہ دعویٰ کرونگا کہ اس مخصوص معنے کے لحاظ سے بھی معاد کا اعتقاد بالکل بے معنی سی بات ہے، اور گو اس کے وعظ و تلقین ایک عامی شخص کی صحت اخلاق کے لئے ضروری ہو لیکن ارباب فہم کے لئے اسکی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی

ہرچند معاد کے مسایل ایسے نہیں ہیں جنپر اس سے قبل کوئی گفتگو نہ کی گئی ہو، کیونکہ مذاہب کے قیام و بقا کا انحصار ہی اسپر ہے اور ہر وقت اور ہر قوم میں اسپر بحث کی گئی ہے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ یہ مسئلہ بھی منجملہ ان بہت سے مسائل کی ہے جن پر تا بقائے نسل انسانی ہمیشہ گفتگو کی جائے گی اور ہمیشہ اختلاف آرا پایا جائے گا - اس لئے میرا اس مسئلہ پر اظہار خیال کسی جدید بحث کا آغاز تو نہ ہوگا لیکن یہ یقینی ہے کہ جو کچھ لکھونگا وہ میری تحقیقی رائے ہوگی، میرے نقطۂ نظر سے بالکل پُرخلوص رائے ہوگی، خواہ وہ معتقدات عامہ سے کتنی ہی منحرف کیوں نہ ہو - مسئلہ عذاب و ثواب یا بہشت و دوزخ پر گفتگو کرنا اس قدر کثیر ذیلی مباحث کا پیدا کرنیوالا ہے کہ اس کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ میرا شعار تمام مذہبی مسائل میں صرف "تمسک بالقرآن" ہوتا ہے اسلئے میں کوشش کرونگا کہ مختصر سے مختصر مقالہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں اور اس بحث کے دیگر "انشعابات" پر اگر نگاہ ڈالنا ضروری ہو بھی تو صرف سرسری نگاہ سے کام لوں -

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسئلہ معاد کوئی نئی چیز نہیں ہے اور قدیم ترین مباحث انسانی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم قدیم ایام سے ایسی نہیں گزری جس نے اپنے مدارک و مدارج ذہنی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ "عالم بعد الموت" پر فکر نہ کی ہو اور مذہب کے وجود کی بنیاد اس خیال پر نہ قائم کی گئی ہو کہ اس دنیا کے بعد ایک عالم اور بھی ہے جہاں محاسبۂ اعمال ہوگا، عذاب و ثواب ہوگا، بہشت و دوزخ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

مذہب کیونکر عالم وجود میں آیا، یہ اب کوئی سربستہ راز نہیں رہا اور نہ اس کی غایت کا علم اب پردۂ خفا میں ہے۔ قانون و مذہب میں مقدم وجود قانون ہی کا ہے لیکن واضعین قوانین نے دیکھا کہ اس سے فسادات کا سد باب پوری طرح ممکن نہیں ہے تو انھوں نے مذہب کو پیدا کیا تاکہ انسان کی طبیعت ہی صلاحیت پسند ہو جائے اور قلب انسانی میں بھی خطرۂ جرم نہ آوے۔ تصفیۂ اخلاق، تزکیۂ نفس، نظام تمدن، تشکیل ہیئت اجتماعی یہی وہ سب باتیں تھیں جو قانون کے بھی پیش نظر تھیں لیکن جب وہ ان کے حصول میں کامیاب نہ ہوا تو مذہب پیدا کیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ تدبیر اختیار نہ کی جاتی تو آج بھی دنیا اسی عہد وحشت و بربریت میں ہوتی جو کسی وقت اس سے قبل پایا جاتا تھا۔ تکلیف سے بچنا، آرام و راحت کی طرف دوڑنا، فطرت انسانی ہے، اس لئے اگر اس فلسفہ کو پیش نظر نہ رکھا جاتا اور مذہب کو اس سے بیگانہ رکھا جاتا تو وہ بالکل بیجان چیز رہتا اور مقصود حاصل نہ ہوتا، اس لئے مذہب کی بنیاد وہی معاد کے خیال، عذاب کے ڈر اور ثواب کی تمنا پر قائم کی گئی، پھر چونکہ اس اعتقاد کے لئے ضروری تھا کہ انسان کی حیات ثانیہ کو بھی ثابت کیا جائے (کیونکہ بغیر اس کے عذاب و ثواب کا مفہوم کوئی اہمیت نہ رکھ سکتا تھا) اس لئے حشر اجساد اور بقاء روح کو ضروری قرار دیا گیا۔ یہ تھی مذہب کی بالکل ابتدائی تحریک جس کو میں انتہائی بھی کہونگا، کیونکہ اس وقت بھی مذہب ہیں کا تار و پود اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

روح کیا ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ آج تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ اس پر مستقل تصانیف روز شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جس کو دیکھ کر کسی شخص کو اطمینان کلی ہو سکے۔ میں اس صحبت میں تمام اکابر و اعاظم کی تحقیق سے بحث نہیں کرونگا، بلکہ غور کرونگا کہ کلام مجید میں اس کے متعلق کیا بتایا گیا ہے۔

غالباً آپ یہ سُن کر متحیر ہوں گے کہ شروع سے لیکر اس وقت تک تمام مفسرین نے اس باب میں سخت غلطی کی ہے اور کلام مجید کی اُن آیتوں سے جن میں لفظ روح پایا جاتا ہے، مسئلہ روح کے حل کرنے میں مدد لی ہے، حالانکہ "روح انسانی" کے لئے جس کا تعلق حیات و ممات سے ہے، ایک جگہ بھی کلام پاک میں روح کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔

لفظ روح قرآن پاک میں ہر جگہ "الہام" اور "قوت رشد و ہدایت" کے لئے آیا ہے۔ میں اس جگہ ان تمام آیات کو نقل نہیں کرونگا جنہیں لفظ روح استعمال کیا گیا ہے بلکہ سورۂ مومن کی صرف ایک ایسی آیت پیش کرونگا جس سے یقینی طور پر یہ امر ثابت ہو سکتا ہے کہ لفظ روح سے خدا کا کیا مفہوم ہے وہ آیت یہ ہے:۔

رفیع الدرجات ذو العرش یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ لینذر یوم التلاق۔

یعنی بلند مرتبہ والا، صاحب قوت (خدا) ڈالتا ہے روح (پیدا کرتا ہے قوت رشد و ہدایت) اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے تاکہ وہ ڈرائے انجام سے۔

اگر روح سے مراد روح انسانی ہوتی تو پھر یہ تخصیص کیونکر ممکن تھی کہ "جس بندہ کو چاہتا ہے یہ روح عنایت کرتا ہے" روح انسانی تو ہر آدمی میں پائی جاتی ہے اور اس سے کوئی خالی نہیں، اس لئے معلوم ہوا کہ روح سے مراد خدا کا الہام یا قوت رشد و ہدایت ہے۔

اسی پر قل الروح من امر ربی کا بھی قیاس کر لیجئے۔ یہاں روح سے قرآن مراد ہے یسئلونک عن الروح (یعنی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ قرآن جسے تم الہامات ربی کہتے ہو کیا ہے) قل الروح من امر ربی (تو اس کے جواب میں اے رسول تم کہدو کہ یہ الہامات سب حکم خداوندی و منشاء ایزدی کا نتیجہ ہیں) وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (جس کے سمجھنے کی اہلیت تم میں بہت کم ہے۔)

آپ قرآن پاک کھول کر سورۂ بنی اسرائیل میں اس آیت کے قبل و بعد کی آیتوں پر غور کیجئے، آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ روح سے مراد کیا ہے۔

اسی طرح سورۂ النحل کی ایک آیت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ لفظ روح سے روح انسانی مراد نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی قوائے ملکوتی حکم خداوندی سے الہامات پیدا کرتے ہیں اپنے مخصوص بندوں میں)۔ یہاں بھی وہی علی من یشاء ہے۔ ہر انسان مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح مسیح کے بیان میں نفخ روح سے جو مراد ہو سکتی ہے ظاہر ہے بہرحال روح انسانی کے لئے کلام مجید میں لفظ روح کسی جگہ نہیں آیا ہے اور اس کے سمجھنے میں تقریباً سب نے غلطی کی ہے، اس لئے اب غور طلب یہ امر ہے کہ اگر لفظ روح، روح انسانی کے لئے نہیں آیا ہے تو پھر اس معنی میں کس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس کے لئے لفظ نفس استعمال کیا گیا ہے، لیکن مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔ میرے نزدیک کلام مجید میں نفس کا لفظ ضمیر یا (Conscience) کے مفہوم میں آیا ہے۔

سورۂ قیامت میں ہے "ولا اقسم بالنفس اللوامۃ" سورۂ الفجر میں ہے یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ سورۂ شمس میں ہے ونفس وما سواہا۔ ان میں سے ہر جگہ نفس سے مراد ضمیر انسانی ہے۔ اور اگر نفس سے مراد واقعی روح انسانی مراد ہوتی تو اس مفہوم کے علاوہ کسی اور معنی میں یہ لفظ استعمال نہ ہوتا، حالانکہ ظاہر ہے کہ کل نفس ذائقۃ الموت میں نفس سے مراد روح انسانی نہیں بلکہ دنیاوی ہستی مراد ہے۔

الغرض میری جستجو کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام مجید میں نہ روح کی حقیقت سے کہیں بحث کی گئی ہے اور نہ اس کی فنا یا بقا کا جھگڑا چھیڑا گیا ہے، اگر روح کا بقا ثابت ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار کلام مجید نہیں ہے، اور اگر روح فانی ثابت ہوتی ہے تو قرآن کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر حیات بعد الموت کو مذہباً تسلیم کیا جاتا ہے اور حیات بھی بالکل ویسی ہی جیسی اس دنیا میں پائی جاتی ہے یعنی جسم کے ساتھ تو از روئے نتیجہ یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نہ صرف روح انسانی بلکہ انسانی جسم بھی غیر فانی چیز ہے، حالانکہ جسم کی بقا کا

کوئی قایل نہیں۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ جسم از سر نو پیدا کیا جائے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ روح کا دوبارہ پیدا ہونا بھی ناممکن نہیں ہے، جس طرح اول اول جسم کے ساتھ روح پیدا ہوئی تھی، اسی طرح بعد کو بھی جب جسم پیدا ہوگا، روح بھی اُس کیساتھ وجود میں آجائے گی۔ اس لئے وہ جماعت جو حشر اجساد کے قایل ہے کسی طرح روح کی بقا کو دلایل عقلی سے ثابت نہیں کر سکتی۔

بہرحال قبل اس کے حشر اجساد پر بحث کی جائے، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ آیا معاد کا اعتقاد محض لوگوں میں خشیت پیدا کرنے اور اُن کے اخلاق درست کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا حقیقتاً عقل کے نزدیک بھی وہ قابل قبول ہے۔ آئیے پہلے ایک نظر اس سوال پر بھی ڈال لیں۔ جس وقت ہم کائنات اور عالم خلق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلی وہ چیز جو ہماری عقل کو حیران بنا دیتی ہے اس کی وسعت و تنوع ہے۔ کائنات نام اُس کرۂ ارض کا نہیں جس کا دور صرف ۲۴۰۰۰ میل ہے اور جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک معمولی سیارہ ہمارے نظام شمسی کا ہے، بلکہ کائنات اور عالم خلق میں تمام وہ فضاء بسیط شامل ہے جس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جنھوں نے فلکیات کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ امر مخفی نہیں کہ ہمارا نظام شمسی کیا ہے؟ اس میں علاوہ زمین کے اور بڑے بڑے سیارے (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل وغیرہ) بھی ہیں ان سیاروں کے چاند بھی ہیں چھوٹے چھوٹے ستارے بھی ہیں، بیشما شہاب ثاقب اور دمدار ستارے بھی پائے جاتے ہیں اور مختصر اً یوں سمجھئے کہ نظام شمسی کا محیط ۱۱ ارب میل ہے لیکن باوجود اس قدر عظمت کے یہ سارا نظام شمسی کائنات کی وسعت کے لحاظ سے اس قدر حقیر چیز ہے کہ اگر اسکو آج محو کر دیا جائے تو کائنات کو اتنا ہی نقصان نہیں پہونچ سکتا جتنا سمندر کو ایک قطرہ کے نکل جانے سے" (باقی)

نیاز

ہندوستانی ایکاڈیمی

معلومات

ہوائی تجارت

اس وقت انگلستان میں ایک ہوائی جہاز ایسا طیار ہو رہا ہے جس کی لمبائی ۷۰۹ فٹ ہوگی اور قطر ۱۳۳ فٹ اس کے ہیکل (Body) کے ڈھلنے کے لئے ۲۲۵۰۰۰ مربع فٹ کپڑا درکار ہوگا اس کا ہیکل الیومینیم کا بنایا جائے گا۔

اس میں چھ بڑے موٹر رولز رائس کے ہوں گے جن کی قوت ۶۵۰ گھوڑوں کی ہوگی اور چھوٹے چھوٹے موٹر ان کے علاوہ ہونگے اس کے درمیان میں کمرے ہوں گے جن میں ۹۰۰ مسافر بیٹھ سکیں گے چالیس آدمی اس کے چلانے والے ہوں گے۔ کھانے کے کمرے میں بیک وقت ۵۰ آدمی کھانا کھا سکیں گے۔

اسی طرح فریڈر کہافن میں بحیرۂ کونسٹانس پر ایک جہاز اہل جرمن طیار کر رہے ہیں جن کی لمبائی ۷۶۳ فٹ ہوگی اور قطر ۹۷ فٹ اس کی رفتار ۸۰ میل فی گھنٹہ تک ہوگی اور ایک مرتبہ اڑ کر ۶۲۵۰ میل تک برابر بغیر وقفہ کے سفر کر سکیگا۔ اس کے موٹر پانچ ہیں جن کی قوت ۵۳۰ گھوڑوں کی ہوگی۔ آئندہ موسم بہار میں یہ جہاز برلن سے امریکہ کا سفر کریگا۔

کہر کا دشمن

امریکہ کی ایک برقی کمپنی نے ایک خاص قسم کے گیس سے قرمزی رنگ کی روشنی پیدا کی ہے جو کہر کو منور کر دیتی ہے، ایک دن صبح کو جب کہ کہر کی کثرت سے نظر بیکار ہوگئی تھی یہ روشنی پیدا کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف میل تک کہر غائب ہوگیا اور ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔

یہ ایجاد ہوائی جہازوں کے لئے بڑی نعمت ہے کیونکہ ان کا سب سے بڑا دشمن کہر ہے جو فضا کو اُن کے لئے بالکل ناقابل سفر بنا دیتا ہے۔

کائنات کی وسعت

روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی منٹ ہے اور یہی رفتار لاسلکی امواج کی ہے۔ اس لئے تقریباً سات منٹ میں روشنی سارے کرۂ زمین کا چکر لگا لیتی ہے۔ لیکن کائنات کی وسعت کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ اسی روشنی کو جو ایک منٹ میں تقریباً دو لاکھ میل کا سفر کر لیتی ہے اس کو ایک کرور سال کائنات کا دورہ کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ یا دوسری طرح اس وسعت کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر سارے کرۂ ارض کو مختصر کرکے ایک نہایت قصر جوہر فرد (ذرۂ لایتجزی) میں تبدیل کر دیا جائے تو عالم کو اسی نسبت سے پورے کرۂ ارض کے برابر ماننا پڑے گا۔

مسلک نسبیۃ (Relativity) میں اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ اگر ایک ارب کرے زمین کے برابر فضا میں گردش کرتے ہوئے تسلیم کئے جائیں تو بھی کائنات کی وسعت کا ایک گوشہ ان سے نہیں بھر سکتا۔

سورج زمین سے حجم میں ۱۰ لاکھ گنا اور جرم میں تین لاکھ گنا بڑا ہے۔ سورج کے تابع جتنے اور اجرام فلکی ہیں اُنکا اندازہ ۳۰ ہزار

ملین کیا جاتا ہے۔ پھر بھی چھوٹے ستارے فضا کے اندر نہیں ہیں بلکہ ہر سدیم یا تو اسی طرح کا نظام شمسی رکھتا ہے یا زمانہ کی گردش کے بعد رکھنے والا ہے۔

پھر سدیم کی وسعت کا اندازہ کس سے ہو سکتا ہے جس کے اندر اس قدر مادہ پایا جاتا ہے کہ اس سے کروروں آفتاب بن سکتے ہیں اور جو اس قدر لطیف ہے کہ ایک اونس کا دس لاکھواں حصہ ۱۵ ہزار فٹ بلند پہاڑ کے برابر جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ پروفیسر ال کا بیان ہے کہ اس وقت ۲۰ لاکھ سدیم کا اس طرح کی دوربین سے دیکھے گئے ہیں اور وہ فضا جو دوربین کی حد سے باہر ہے اس سے ایک ارب گنا زائد ہے۔ اگر سدیم کی تعداد فضا میں کم سے کم دس کھرب ہو اور ہر سدیم میں ایک ہزار ملین ستارے ہوں تو فضا کے تمام ستاروں کی تعداد کم سے کم..................۲۰۰۰۰ ہوگی

اس کے بعد دیکھئے کہ ہمارا کرۂ کائنات میں کیا اہمیت رکھ سکتا ہے۔

نوبل پرائز

سویڈن کے ایک مشہور علم الکیمیا نے جس کا نام نوبل تھا ڈائنامیٹ بنانے سے بے اندازہ دولت کمائی تھی ۱۸۹۶ء میں اپنے مرنے سے قبل اس نے اپنی اکثر دولت سالانہ پانچ انعاموں کے لئے وقف کر دی اور چالیس ہزار گنی ہر انعام کی رقم مقرر کر کے وصیت کر دی کہ مختلف علوم کے ماہرین کو یہ انعامات دئے جائیں۔

اول مرتبہ ۱۹۰۱ء میں نوبل کی وفات کے ۵ سال بعد انعام دئے گئے طبعیات میں پروفیسر رنجن کو، کیمیا میں وانٹ ہوا کو، طب میں ڈاکٹر بہرنگ کو اور ادب میں سلی برودوم کو

اس وقت تک ۲۷ مرتبہ ۱۴۱ مردوں اور ۴ عورتوں کو یہ انعام مل چکا ہے، جن میں سے ۲۴ انعام طب و فزیالوجی کے لئے ۳۳، طبعیات کے لئے، ۲۳ کیمیا کے لئے، ۲۶ ادب کے لئے اور ۲۸ امن کی سعی کرنے والوں کے لئے تھے۔

ان میں سے اہل جرمنی نے تیس انعام حاصل کئے جن میں زیادہ تر کیمیا اور طبعیات سے متعلق تھے، اہل فرانس نے ۲۴ انعام حاصل کئے، اہل انگلستان نے اکیس، اہل سویڈن نے ۹، اہل امریکہ نے ۸، سوئٹزرلینڈ والوں نے ۷، ڈنمارک اور ہالینڈ والوں نے چھ چھ، اسپین نے ۳، پولینڈ نے ۲، روس نے ایک، ہندوستان نے ایک اور ناروے، بلجیم، اٹلی اور اسٹریا نے چار چار انعام حاصل کئے۔

ادب کے انعامات میں برطانیہ، فرانس، جرمنی نے چار چار اسپین، ڈنمارک، سویڈن، ناروے اور پولینڈ نے دو دو انعام حاصل کئے، سعی امن کے انعامات میں سب سے زیادہ فرانس کو ملا اور پھر سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کو

خاتونوں میں سے میڈم کوری کو دو انعام طبعیات اور کیمیا کے ملے، سویڈن کی ایک خاتون سلمی لجرلوف کو ادب میں انعام ملا، اور سعی امن کا انعام بھی ایک اور خاتون کو دیا گیا۔

کیڑوں کا احساس الم

بعض کیڑوں میں ایسے دقیق و نازک اعصاب پائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ بعض ایسی کیفیات کو محسوس کر لیتے ہیں جن کو اعصاب انسانی محسوس نہیں کر سکتے۔ مثلاً چیونٹی فوق البنفسجی رنگ کو

بھی دیکھ لیتی ہے اور ہم نہیں دیکھ سکتے

بعض کیڑوں میں چھونے کی ایسی قوت موجود ہے کہ اس کی نزاکت کا تصور بھی انسان کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اسکے بعض علماء کا حال ہے کہ تکلیف کا احساس ان میں نہیں ہے

چنانچہ فرانس کے ایک عالم اوگسٹ خوال نے اس کا تجربہ کرنے کے لئے ایک شہد کی مکھی کا اگلا حصہ سر کا سوائے آنکھوں اور منہ کے قینچی سے کاٹ دیا اور چھوڑ دیا اس کے بعد اس نے دیکھا کہ مکھی پھر پھولوں کی طرف اڑ گرگئی اور اس کو چوسنے کی بیکار کوشش میں مصروف ہوگئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اُس کو اپنے مقدم حصۂ سر کے قطع ہونے کا کوئی احساس نہ تھا۔

اسی طرح اس نے ایک مکھی پکڑی اور اس کے جسم کا پچھلا حصہ بیچ سے کاٹ دیا اُس کے بعد بھی وہ نہ صرف زندہ رہی بلکہ غذا بھی کھاتی رہی اور اس حال سے بیخبر تھی کہ جو غذا اسکے پیٹ میں جاتی ہے وہ سینہ سے ہو کر پھر زمین پر گرجاتی ہے۔ اسی طرح اور بھی متعدد تجربوں سے بعض کیڑوں کے عدم احساس الم کو ثابت کیا گیا ہے۔

دو عجیب و غریب ایجادیں

امریکہ کے ایک ماہر برقیات ونزلی نے ایک عجیب و غریب آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام اس نے (Televox) رکھا ہے یہ آلہ حقیقتاً ایک مستقل خادم ہے اور زندہ انسان کی طرح کام کرتا ہے۔ اس مصنوعی انسان کے ہاتھ بھی ہیں، کان بھی ہیں اور وہ ان سے وہی کام لیتا ہے جو ایک انسان کر سکتا ہے

اس انسان کے مختلف اعضا، لاسلکی امواج سے مختلف صورتوں میں متاثر ہوتے ہیں اور ان سے وہی افعال ظہور میں آتے ہیں جو انسان سے ظاہر ہونے چاہیئے۔ دوسرے الہ کا نام (Integraph) ہے یہ آلہ ایک بڑے ریاضی داں انسان کی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

اس وقت تک ریاضی کے متعلق جو آلے ایجاد ہوئے تھے وہ صرف یہی کر سکتے تھے کہ معمولی رقموں کو جوڑ دیں، ضرب و تقسیم کا معمولی جواب نکال دیں، لیکن یہ آلہ نہایت مکمل ہے اور ریاضی کے تمام پیچیدہ سوالات حل کر سکتا ہے۔

مصنوعی حنجرے

سر رچرڈ نے اپنے ایک لکچر کے دوران میں میز پر مقوی کے متعدد ٹکڑے رکھے، جو انسان کے حنجرہ کی صورت کے تھے انیں متعدد نلکیاں لگی ہوئی تھیں جن کا تعلق ایک دھونکنی سے تھا جس کو سر رچرڈ کی لڑکی دھونکتی تھی۔ ان مصنوعی حنجروں میں ہر ایک سے مختلف حروف کا تلفظ مختلف لب و لہجہ کے ساتھ پیدا ہوتا تھا۔ یہ حنجرے بالکل اسی اصول پر بنائے گئے تھے جو انسانی حنجروں کی ساخت سے متعلق ہے۔

اگر ان حنجروں کو اس مصنوعی انسان سے ملا دیا جائے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو پھر یقیناً ایک ایسا انسان پیدا ہو سکتا ہے جس کی انسانیت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

نمائندۂ نگار کی ڈائری

۱۱ اپریل کو کاشانۂ مصطفا میں محمد ادریس صاحب سے جو بریلی کے رئیس ہیں اور ایک مشہور کارخانۂ فرنیچر کے مالک ہیں ملاقات ہوئی آپ نے ایک سال کیلئے نگار کی خریداری منظور فرمائی۔ قریب ۳ بجے کے مصطفا صاحب سے رخصت ہو کر دفتر پہنچا۔ مولانا نیاز بہت مصروف تھے تاہم وقت نکال کر سفر کا پروگرام بنایا۔ مولانا نے کچھ خطوط لکھ کر دئے آج شام ہی کو روانہ ہوا لیکن گاڑی نہ مل سکی اور واپس دفتر آگیا۔ آسی صاحب افسر صاحب و مولانا نیاز کہیں جانے ہی والے تھے۔ میں بھی شوکت صاحب کے ساتھ وقت کاٹنے نکل گیا جو مجھے پہونچانے اسٹیشن تک گئے تھے۔ رات کو قیام گاہ پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ مولانا ہنوز واپس نہیں آئے، ملازم نے فوراً میز پر کھانا لگا دیا کھانے کے بعد کچھ چہل قدمی کی اور پھر سو گیا۔ ۱۲ اپریل۔ ملازم نے آج معمول سے پہلے مجھے جگا دیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر سامان ٹھیک کیا۔ ملازم تانگہ لے آیا۔ مولانا سے چلتے وقت ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہا بالکل صحیح وقت پر اسٹیشن پہنچا۔ (کانپور) کا ٹکٹ لیا۔ اتفاق سے جس گاڑی میں بیٹھا۔ اسی میں جناب ہادی مچھلی شہری تشریف فرما تھے۔ بہت عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ ہادی صاحب کے ذریعہ سے وحیدالدین صاحب سوداگر سے تعارف ہوا وحید صاحب نے دکانپور) پہنچکر نگار کی خریداری کا وعدہ فرمایا۔ مجھ سے قریب ہی جناب ارشاد حسین صاحب تشریف رکھتے تھے صاحب موصوف شروع ہی سے ہمارے پرچے کے معاون ہیں ۲۷ء میں خریداری کا انقطاع ہو گیا تھا میری گزارش پر اپریل ۲۸ء سے پھر خریداری منظور فرمائی ۹ بجے کے قریب دکانپور) آگیا۔ تانگہ لیا۔ مولوی عبدالرؤف صاحب ڈپٹی کلکٹر کے بنگلہ پر پہنچا ایک خط مولانا نیاز کا ڈپٹی صاحب کے نام تھا۔ ملازم سے معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب کہیں معائنہ کے لئے گئے ہیں۔ ملازم نے اسباب ٹھیک کیا۔ میں نہا کر کچھ غیر ارادی طور پر سو گیا ۱۲ بجے ملازم نے کھانے کے لئے جگا دیا۔ میں کھانا کھا ہی چکا تھا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لائے مجھے یہ معلوم ہوا گویا میں کسی فرشتہ سے مل رہا ہوں۔ ڈپٹی صاحب کو کچہری جانا تھا اسلئے وہ مجھ سے جلد رخصت ہو گئے میں بھی کچہری پہنچا۔ بابو کرشن سہائے صاحب وکیل سے ملا وکیل صاحب نہایت خلق سے پیش آئے۔ ۱۳ اپریل۔ فراش خانہ پہنچا محب اللہ صاحب نے نگار کی توسیع اشاعت میں بہت کچھ حصہ لیا۔ اور بہت اصحاب سے میرا تعارف کرایا عبدالحمید صاحب نے بھی بہت دلچسپی لی عبدالغفار صاحب برادرس اور وحید الحسن صاحب وکیل نے ایک ایک سال کی خریداری شروع سال سے منظور فرمائی۔ ۱۴ اپریل میاں محمد بشیر صاحب بیرسٹر و میاں محمد نظیر صاحب نے زرسالانہ مرحمت فرمایا۔ فضل حسین صاحب اڈیٹر البرید نے اسلامیہ یتیم خانہ لائبریری کے لئے رعایتی قیمت پر ایک سال کے لئے رسالہ جاری کرایا۔ ۱۵ اپریل۔ وحیدالدین صاحب بھی ایک سال کے لئے خریدار ہو گئے اسی دن حلیم مسلم لائبریری کے لئے رعایتی قیمت پر ایک سال کے لئے رسالہ جاری کیا گیا۔ حافظ عبداللطیف نے زرسالانہ مرحمت فرمایا اور حاجی محمد داؤد خاں صاحب سوداگر چرم کے ایک خصوصی کارکن صاحب نے ایک سال کے اجرا کی اجازت دی۔ ۱۶ اپریل۔ بابو انور علی صاحب سوداگر چرم جناب صدرالدین محمد حسین صاحبان و میاں جی عبداللطیف صاحب سوداگر چرم نے زرسالانہ مرحمت فرما کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا۔

۱۷ اپریل۔ حافظ محمد صدیق صاحب رئیس و میونسپل کمشنر نے ایک سال کے لئے خریداری منظور فرمائی۔ ۱۸ اپریل۔ میں کانپور سے رخصت ہو کر اٹاوہ پہونچا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول نے ایک سال کی خریداری فرما کر ممنون فرمایا۔ ہمارے قدیم معاون

سید بدر الحسن صاحب کے ذریعہ سے محمد یحییٰ شریف الحسن صاحبان سوداگران چرم نے خریداری منظور فرماکر زر سالانہ سے اعانت فرمائی - ۱۹ اپریل - مولوی عبد الحفیظ صاحب ڈپٹی کلکٹر نے ششماہی خریداری منظور فرمائی - ۲۰ اپریل - عابد حسن خاں صاحب رئیس مینوسپل کمشنر نے ایک سال کی خریداری منظور فرمائی - اور جناب شفقت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر گورکھپور اور بشیر حسین صاحب انکم ٹیکس افیسر نے اجرا ر نگار کی اجازت دی جو صاحب موصوف نگار کے قدیم معاون ہیں - اسی سلسلہ میں مجھے مسٹر نفیس الحسن وکیل منشی احتشام صاحب، جناب احمد علی خاں صاحب، حبیب حسن خانصاحب مسٹر فاروق احسن خاں صاحب، اصغر حسین صاحب، بابو جوالا پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹر اور انکے علاوہ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنھوں نے کانپور، فرخ آباد، اٹاوہ مین پوری، اور قنوج وغیرہ میں عام "بقیہ"

ادبی جواہر

تذکرہ حسینی (فارسی) یہ ایک تذکرہ ہے جسمیں ہندوستان و اہل ایران کے فارسی گو شعرا کا ذکر ہے مگر مصنف نے اس خوبی اور عمدہ ترتیب کے ساتھ لکھا ہے کہ دیکھکر بیساختہ منہ سے کلمات آفرین نکل جاتے ہیں درمیان درمیان جو حکایات درج ہیں انھوں نے دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے - قیمت ۱۱ر

سراپائے سخن (اردو) یہ بھی ایک تذکرہ ہے جسمیں معشوق کے تمام اعضاء کی تعریف میں اساتذہ معروف و مشہور کے اشعار دئے گئے ہیں - عہ

زندگانی بینظیر (اردو) یعنی سوانح عمری میاں نظیر اکبر آبادی - ہندوستان کے مشہور اور مقبول ہر دلعزیز شاعر نظیر کی سوانحعمری نہایت اعلیٰ عبارت میں درج کی گئی ہے از پروفیسر شہباز قیمت عہ

سخن شعرا (اردو) ایک جامع اور دلچسپ تذکرہ شعرا - مصنف مولوی عبد الغفور نساخ قیمت عہ

کلیات انوری (فارسی) محمود غزنوی کے دربار کے سب سے بڑے شاعر انوری کا کلام مع ہزلیات قیمت عہ

دیوان شمس تبریز (فارسی) صوفیانہ بادۂ تصوف میں ڈوبا ہوا کلام ہے نہایت عمدہ کاغذ پر صحت و اہتمام کیساتھ حال ہی میں طبع ہوا ہے عہ

دیوان نعمت خان عالی (فارسی) نعمتخاں عالی وہ شاعر ہے جس کمال نے اُسے عالمگیر ایسے بادشاہ کے دربار میں ہر دلعزیز بنایا

دیوان ملا نور الدین ظہوری (فارسی) ظہوری وہ شاعر ہے جسے بھی مانا اور اس کا اتباع کیا ہے اسکا تمام و کمال کلام یہ ہے قیمت

کلیات مرزا جلال اسیر (فارسی) جلال اسیر ان مشہور و مقبول شعرا میں سے ہے جو صاحب طرز گزرے ہیں - قیمت عہ

کلیات ظفر ہر چہار جلد (اردو) آخری تاجدار دہلی کا تمام و کمال کلام فصاحت زبان - روزمرہ - اور محاورہ میں ڈوبا ہوا ہے عہ

کلیات مومن - حضرت مومن کا پایہ شعرا میں اتنا زبردست ہے کہ بڑے بڑے شعرا بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے قیمت

دیوان ناسخ - اس کو نہایت صحت کے ساتھ چھوٹی تقطیع پر چھاپا ہے جس سے شان کلام بڑھ گئی ہے قیمت عہ

کلیات میر - ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر میر کے پورے کلام کا مجموعہ ہے قیمت عہ **کلیات سودا** - میر کے حریف ظریف کا وہ کلام جسنے انکے معاصرین پر انکی دھاک بٹھادی تھی - ہر صنف شعر میں استاد کامل تھے قیمت عہ

المشتہر - **منیجر نولکشور بکڈپو لکھنؤ**